بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6940

سورۃ نوح (71)

آیت نمبر (1 تا 14)

ترکیب

(آیت۔3۔4) اُعۡبُدُوۡا، اِتَّقُوۡا، اَطِیۡعُوۡا، فعل امر ہیں۔ ان کا جواب امر ہونے کی وجہ سے یَغۡفِرۡ اور یُؤَخِّرۡ مجزوم ہوئے ہیں۔ (آیت۔5) لَیۡلًا اور نَہَارًا ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ (آیت۔6) لَمۡ یَزِدۡ کا فاعل دُعَآءِیۡ ہے اور اس کا مفعول ھُمۡ کی ضمیر ہے۔ جبکہ فِرَارًا کی نصب تمیز ہونے کی وجہ سے ہے۔ (آیت۔7) کُلَّمَا شرط ہے اس لیے اس کے آگے آنے والے افعال ماضی کا ترجمہ حال میں ہوگا۔ اِسۡتِکۡبَارًا کی نصب مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے ہے۔ (آیت۔8) جِہَارًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت۔9) اِسۡرَارًا مفعول مطلق ہے۔ (آیت۔10) کَانَ کی خبر ہونے کی وجہ سے غَفَّارًا حالتِ نصب میں ہے۔ کَانَ کا ترجمہ حال میں ہوگا کیونکہ یہ آفاقی صداقت کا بیان ہے (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:49، نوٹ۔2) (آیت۔11) یُرۡسِلِ میں لام کی کسرہ بتا رہی ہے کہ یہ مضارع مجزوم ہے اور سابقہ آیت میں فعل امر اِسۡتَغۡفِرُوۡا کا جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا ہے۔ اس کا مفعول اَلسَّمَآءَ ہے اور مِدۡرَارًا حال ہے۔ (آیت۔12) یُمۡدِدۡ اور یَجۡعَلۡ بھی سابقہ فعل امر اِسۡتَغۡفِرُوۡا کا جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ جبکہ جَنّٰتٍ اور اَنۡہٰرًا مفعول ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ (آیت۔13) تَرۡجُوۡنَ کا مفعول وَقَارًا ہے۔ (آیت۔14) اَطۡوَارًا حال ہے۔

ترجمہ

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا	نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ	اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ	مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ
بیشک ہم نے بھیجا	نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف	کہ آپؑ خبردار کریں اپنی قوم کو	اس سے پہلے کہ پہنچے ان کے پاس

عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ﴿۱﴾	قَالَ یٰقَوۡمِ	اِنِّیۡ لَکُمۡ	نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۲﴾	اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ
ایک دردناک عذاب	انہوںؑ نے کہا اے میری قوم	بیشک میں تمہارے لیے	ایک واضح خبردار کرنے والا ہوں	کہ تم لوگ بندگی کرو اللہ کی

وَاتَّقُوۡہُ	وَاَطِیۡعُوۡنِ ﴿۳﴾	یَغۡفِرۡ لَکُمۡ
اور تقویٰ اختیار کرو اس کا	اور اطاعت کرو میری	تو وہ بخش دے گا تمہارے لیے

مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ	وَیُؤَخِّرۡکُمۡ	اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ
تمہارے گناہوں میں سے	اور وہ پیچھے کرے گا (مہلت دے گا) تم کو	ایک مقررہ مدت تک

اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ	اِذَا جَآءَ	لَا یُؤَخَّرُ	لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴﴾	قَالَ رَبِّ
بیشک اللہ کا (مقرر کردہ) وقت	جب آ جائے	تو وہ مؤخر نہیں کیا جاتا	کاش تم لوگ جانتے	انہوںؑ نے کہا اے میرے رب

اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ	لَیۡلًا وَّ نَہَارًا ﴿۵﴾	فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ	دُعَآءِیۡۤ	اِلَّا فِرَارًا ﴿۶﴾
بیشک میں نے بلایا اپنی قوم کو	رات میں اور دن میں	تو زیادہ نہیں کیا ان کو	میرے بلانے نے	سوائے بھاگنے کے

وَاِنِّیۡ کُلَّمَا	دَعَوۡتُہُمۡ	لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ	جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ
اور بیشک میں نے جب بھی	بلایا ان کو	تاکہ تو بخش دے ان کے لیے (ان کے گناہ)	تو وہ رکھ لیتے ہیں اپنی انگلیاں

فِيْٓ اٰذَانِهِمْ	وَاسْتَغْشَوْا	ثِيَابَهُمْ	وَّاَصَرُّوْا
اپنے کانوں میں	اور خود کو ڈھانپتے ہیں	اپنے کپڑوں سے	اور اڑ جاتے ہیں

وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ﴿۷﴾	ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ	جِهَارًا ۙ﴿۸﴾
اور بڑائی چاہتے ہیں جیسے بڑائی کا حق ہے	پھر بیشک میں نے بلایا ان کو	آواز بلند کرتے ہوئے

ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ	وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ	اِسْرَارًا ۙ﴿۹﴾	فَقُلْتُ
پھر بیشک میں نے اعلان کیا ان کے لیے	اور میں نے چپکے سے کہا ان سے	جیسے چپکے سے کہتے ہیں	تو میں نے کہا

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ	اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾	يُّرْسِلِ
تم لوگ مغفرت مانگو اپنے رب سے	بیشک وہ بہت بخشنے والا ہے	(مغفرت مانگو گے) تو وہ بھیجے گا

السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ	مِّدْرَارًا ۙ﴿۱۱﴾	وَّيُمْدِدْكُمْ	بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ
آسمان کو تم لوگوں پر	لگاتار برسنے والا ہوتے ہوئے	اور وہ اعانت کرے گا تمہاری	اموال (معیشت) سے اور بیٹوں (افرادی قوت) سے

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ	وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ﴿۱۲﴾	مَا لَكُمْ
اور وہ بنائے گا تمہارے لیے کچھ باغات	اور بنائے گا تمہارے لیے کچھ نہریں	تم لوگوں کو کیا ہوا ہے

لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ	وَقَارًا ۚ﴿۱۳﴾	وَقَدْ خَلَقَكُمْ	اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾
(کہ) تم لوگ امید نہیں رکھتے اللہ سے	کسی عظمت کی	حالانکہ اس نے پیدا کیا ہے تم لوگوں کو	مختلف حالتوں پر ہوتے ہوئے

نوٹ: 1

سابقہ سورہ۔ المعارج۔ میں عآب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب اور پیغمبر ﷺ کو صبر و انتظار کی تلقین ہے۔ اس سورہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے مراحل، ان کے طویل صبر و انتظار اور بالآخر ان کی قوم کے مبتلائے عذاب ہونے کی سرگزشت اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور اس سے مقصود آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی قوم کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دینا ہے جس میں آپؐ بھی دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے صبر و انتظار کے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ساتھ ہی آپؐ کی قوم بھی دیکھ لے کہ اللہ تعالیٰ جلد بازوں کو ان کی جلد بازی اور طنز و طعن کے باوجود ڈھیل دیتا ہے لیکن بالآخر پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو کوئی چھڑانے والا نہیں ہوتا۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 2

آیت۔ 4۔ میں حضرت نوحؑ کی دعوت کے تین بنیادی ارکان بیان ہوتے ہیں، توحید، شریعت الٰہی کی پابندی اور رسول کی اطاعت۔ انہی تین ارکان پر تمام رسولوں کی دعوت مبنی رہی ہے۔ اس حوالہ سے آگے آیت۔ 4۔ میں فرمایا کہ اگر تم نے میری یہ تینوں باتیں مان لیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے ان جرائم کو معاف کر دے گا جن کے سبب سے تم عذاب کے مستحق قرار پائے ہو اور ایک معین مدت تک کے لیے تم کو اس دنیا میں رہنے بسنے کی مہلت مل جائے گی۔ یہاں لفظ مِنْ اپنے معروف معنی یعنی تبعیض ہی کے لیے آیا ہے پوری بات گویا یوں ہے کہ اگر تم میری باتیں مان لوگے تو اللہ تمہارے وہ سارے گناہ معاف کر دے گا جو اب تک تم سے صادر ہوئے ہیں، یہ بات معلوم بھی ہے اور معقول بھی کہ کفر کے بعد ایمان کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی کے وہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں جو کفر کی زندگی میں اس سے صادر ہوئے ہوتے ہیں۔ رہے وہ گناہ جن کا ارتکاب آدمی ایمان کی زندگی اختیار کرنے کے بعد کرتا ہے، تو ان کے معاف ہونے کے لیے ایک ضابطہ ہے جو سورۂ نساء کی آیت۔ 17۔ میں بیان ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے ''کچھ نہیں سوائے اس کے کہ توبہ (قبول کرنا) اللہ پر ان لوگوں کے لیے ہے جو برا کام

کرتے ہیں نادانی میں پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔تو یہ لوگ ہیں اللہ جن کی توبہ قبول کرتا ہے۔اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔'' اس آیت میں لفظ مِنْ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے آیا ہے۔اگر یہ مِنْ یہاں نہ ہوتا تو آیت کے یہ معنی بھی نکل سکتے تھے کہ تمہارے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔کیونکہ کفر کے بعد ایمان صرف پچھلے گناہوں کو گرانے والا بنتا ہے، آگے کے گناہوں کا گرانے والا نہیں بنتا۔(تدبر قرآن)۔ 1940

حرف مِنْ اکثر تبعیض کے لیے آتا ہے۔اگر یہ معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے سے تمہارے وہ گناہ معاف ہو جائیں گے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔کیونکہ حقوق العباد کی معافی کے لیے ایمان لانے کے بعد بھی یہ شرط ہے کہ جو حقوق ادائیگی کے قابل ہیں ان کو ادا کرے، جیسے مالی واجبات وغیرہ اور جو قابل ادائیگی نہیں، جیسے زبان یا ہاتھ سے کسی کو ایذا پہنچانا، تو ان کو معاف کرائے۔حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ ایمان لانے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس میں بھی حقوق العباد کی ادائیگی یا معافی شرط ہے۔(معارف القرآن)۔

نوٹ:3

وَيُؤَخِّرْ كُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى کا مطلب یہ ہے کہ تم ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس مدت تک دنیا میں مہلت دے گا جو تمہارے لیے مقرر ہے۔اس کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایمان نہ لائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ مدت مقررہ سے پہلے ہی تم پر عذاب لا کر ہلاک کر دے۔ معلوم ہوا کہ عمر کی مدت مقررہ میں بعض اوقات کوئی شرط ہوتی ہے کہ اس نے فلاں کام کر لیا تو اس کی عمر اتنی ہو گی اور نہ کیا تو اتنی کم کر دی جائے گی۔اللہ کی ناشکری سے عمر گھٹ جانا اور شکر گزاری سے عمر بڑھ جانا، اسی طرح بعض اعمال مثلاً والدین کی اطاعت و خدمت سے عمر میں ترقی ہونا جو احادیث سے ثابت ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضائے الٰہی کو کوئی چیز بجز دعا کے نہیں روک سکتی اور کسی کی عمر میں زیادتی بجز بر والدین کے نہیں ہو سکتی۔بر کے معنی ان کے ساتھ اچھا سلوک ہے اور اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ تقدیر معلق میں ان اعمال کی وجہ سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔

اس کی تشریح تفسیر مظہری میں یہ ہے کہ تقدیر اور قضائے الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک مُبرم یعنی قطعی اور دوسری معلق یعنی جو کسی شرط پر معلق ہو۔قرآن کریم میں ان دونوں قسم کی قضا و تقدیر کا ذکر سورۃ الرعد کی آیت۔39۔میں ہے کہ اللہ تعالیٰ لوحِ محفوظ میں ترمیم و تبدیل کرتا رہتا ہے اور اللہ کے پاس اصل کتاب ہے۔اس سے مراد وہ کتاب ہے جس میں تقدیر مبرم لکھی ہوئی ہے۔(معارف القرآن)

نوٹ:4

آیت۔10 تا 12۔میں جو بات کہی گئی ہے کہ اللہ سے مغفرت کے طلبگار بنو تو اللہ تعالیٰ تمہیں معیشت اور افرادی قوت کی فراوانی عطا فرمائے گا، یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔مثلاً المائدہ۔66، الاعراف۔96، ھود۔3۔52، طٰہٰ۔124۔ان کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا سے بغاوت کی روش صرف آخرت میں ہی نہیں، دنیا میں بھی انسان کی زندگی تنگ کر دیتی ہے۔اس کے برعکس اگر کوئی قوم ایمان و تقویٰ اور احکام الٰہی کی اطاعت کا طریقہ اختیار کر لے تو یہ آخرت ہی میں نافع نہیں بلکہ دنیا میں بھی اس پر نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔قرآن مجید کی اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک مرتبہ قحط کے موقع پر حضرت عمرؓ بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلے اور صرف استغفار پر اکتفا فرمایا۔لوگوں نے کہا کہ آپ نے بارش کے لیے تو دعا کی ہی نہیں۔آپؓ نے فرمایا کہ میں نے آسمان کے ان دروازوں کو کھٹکھٹا دیا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے اور پھر سورۂ نوحؑ کی یہ آیات پڑھ کر لوگوں کو سنا دیں۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:5

آیت۔13۔14 کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بڑائی سے امید رکھنا چاہیے کہ اس کی فرمانبرداری کرو گے تو تم کو عزت و وقار عنایت فرمائے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی بڑائی کا اعتقاد کیوں نہیں رکھتے اور اس کی عظمت و جلال سے ڈرتے کیوں نہیں۔ (حالانکہ تمہارا اپنا وجود اس کی عظمت کی علامت کے طور پر کافی ہے)۔ ماں کے پیٹ میں تم نے طرح طرح کے رنگ بدلے۔ اور اصلی مادے سے لے کر موت تک آدمی کتنی پلٹیاں کھاتا ہے، کتنے اطوار و ادوار اور اتار چڑھاؤ سے گزرتا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

آیت نمبر (15 تا 28)

ترکیب

(آیت۔16) فَعَلَ کے دو مفعول آتے ہیں۔ اس لحاظ سے نُوْرًا اور سِرَاجًا کو اس کا مفعول ثانی بھی مانا جا سکتا ہے اور علی الترتیب اَلْقَمَرَ اور الشَّمْسَ کا حال بھی مانا جا سکتا ہے۔ دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ ہم انہیں حال ماننے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔17) اَنْبَتَ باب افعال ہے۔ اس کا مصدر اِنْبَاتًا ہے، لیکن یہاں مفعول مطلق کے طور پر اِنْبَاتًا کے بجائے ثلاثی مجرد کا مصدر نَبَاتًا آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابواب مزید فیہ کے افعال کا مفعول مطلق اُسی باب کے مصدر سے بھی آ سکتا ہے اور ثلاثی مجرد کے مصدر سے بھی۔ (آیت۔19) یہاں بھی ہم بِسَاطًا کو جَعَلَ کا مفعول ثانی ماننے کے بجائے اسے اَلْاَرْضَ کا حال ماننے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔21) لَمْ يَزِدْهُ کی ضمیر ہٗ دراصل مَنْ کی ضمیر عائد ہے۔ مَالُهٗ اور وَلَدُهٗ لَمْ يَزِدْ کے فاعل ہیں جبکہ خَسَارًا تمیز ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے، یہ بات ہم پڑھ چکے ہیں کہ مَنْ کا لفظ اصلاً واحد ہے لیکن یہ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔ اس آیت میں مَنْ جمع کے معنی میں ہے، البتہ لفظی رعایت کے تحت مَالُهٗ اور وَلَدُهٗ کے ساتھ واحد ضمیریں آئی ہیں، جبکہ معنوی رعایت کے تحت آگے کی آیات میں مَكَرُوْا۔ قَالُوْا۔ قَدْ اَضَلُّوْا، سب جمع کے صیغے آئے ہیں۔ ان میں شامل هُمْ کی فاعلی ضمیریں اسی مَنْ کے لیے ہیں۔ کیونکہ نوحؑ کی قوم نے انؑ کی نافرمانی کرنے میں کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ قوم کے سرداروں کی پیروی کی تھی۔ (آیت۔26) دَيَّارٌ کا لفظ فَعَّالٌ کے وزن پر نہیں ہے۔ کیونکہ اس وزن پر لفظ دَوَّارٌ بنے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل فَيْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر اصلی شکل دَيْوَارٌ بنتی ہے۔ پھر واؤ، یا میں تبدیل ہو کر سابقہ یا میں مدغم ہوتی ہے تو دَيَّارٌ استعمال ہوتا ہے۔

ترجمہ

اَلَمْ تَرَوْا	كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ	سَبْعَ سَمٰوٰتٍ	طِبَاقًا ﴿١٥﴾	وَّجَعَلَ الْقَمَرَ
کیا تم لوگوں نے غور ہی نہیں کیا	کیسے پیدا کیا اللہ نے	سات آسمانوں کو	تہہ در تہہ ہوتے ہوئے	اور اس نے بنایا چاند کو

فِيْهِنَّ نُوْرًا	وَّجَعَلَ الشَّمْسَ	سِرَاجًا ﴿١٦﴾
ان (آسمانوں) میں ایک نور ہوتے ہوئے	اور اس نے بنایا سورج کو	ایک چراغ ہوتے ہوئے

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ	مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿١٧﴾	ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ	فِيْهَا
اور اللہ نے اگایا تم لوگوں کو	زمین سے جیسے اگانے کا حق ہے	پھر وہ واپس لے جائے گا تم لوگوں کو	اس (زمین) میں

وَيُخْرِجُكُمْ	اِخْرَاجًا ﴿١٨﴾	وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ
اور وہ نکالے گا تم کو	جیسے نکالنے کا حق ہے	اور اللہ نے بنایا تمہارے لیے زمین کو

بِسَاطًا ﴿١٩﴾	لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا	سُبُلًا فِجَاجًا ﴿٢٠﴾ ع	قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ
ایک بچھونا ہوتے ہوئے	تاکہ تم لوگ چلو اس (زمین) میں سے	کشادہ راستوں پر	کہا نوحؑ نے اے میرے رب

اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ	وَاتَّبَعُوْا مَنْ	لَّمْ يَزِدْهُ	مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ
بیشک ان لوگوں نے نافرمانی کی میری	اور پیروی کی اُن (سرداروں) کی	زیادہ نہیں کیا جن کو	ان کے مال اور ان کی اولاد نے

اِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾ ج	وَمَكَرُوْا	مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾ ج
مگر بلحاظ خسارے کے	اور ان لوگوں (سرداروں) نے چال چلی	جیسے کوئی زبردست چال چلنے کا حق ہے

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ	وَلَا تَذَرُنَّ	وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ
اور انہوں نے کہا تم لوگ ہرگز مت چھوڑنا اپنے خداؤں کو	اور تم لوگ ہرگز مت چھوڑنا	ودّ کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو

وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾ ج	وَقَدْ اَضَلُّوْا	كَثِيْرًا ۚ
اور (نہ ہی) یعوق اور نسر کو	اور انہوں (سرداروں) نے گمراہ کیا ہے	بہتوں کو

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ	اِلَّا ضَلٰلًا ﴿٢٤﴾	مِمَّا
اور تو زیادہ مت کر ظلم کرنے والوں کو	مگر بلحاظ گمراہی کے	اس (سبب) سے جو

خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ	اُغْرِقُوْا	فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ	فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ
ان کی خطائیں تھیں	ان کو غرق کیا گیا	پھر ان کو داخل کیا گیا ایک آگ میں	پھر انہوں نے نہیں پایا اپنے لیے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اَنْصَارًا ﴿٢٥﴾	وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ	لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ
اللہ کے علاوہ	کچھ (دوسرے) مدد کرنے والے	اور کہا نوحؑ نے اے میرے رب	تو مت چھوڑ زمین پر

مِنَ الْكٰفِرِيْنَ	دَيَّارًا ﴿٢٦﴾	اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ	يُضِلُّوْا عِبَادَكَ
کافروں میں سے (کسی کو)	رہتا بستا ہوا	بیشک اگر تو نے چھوڑا ان کو	تو وہ گمراہ کریں گے تیرے بندوں کو

وَلَا يَلِدُوْٓا	اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾	رَبِّ اغْفِرْ لِيْ	وَلِوَالِدَيَّ
اور نہیں جنیں گے	مگر نافرمانی کرنے والا بڑا ہی ناشکرا	اے میرے رب تو بخش دے میرے لیے	اور میرے والدین کے لیے

وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ	مُؤْمِنًا	وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۚ
اور اس کے لیے جو داخل ہوا میرے گھر میں	ایمان لانے والا ہوتے ہوئے	اور ایمان لانے والوں

وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ	وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ	اِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾ ع
اور ایمان لانے والیوں کے لیے (گناہوں کو)	اور تو زیادہ مت کر ظالموں کو	مگر بلحاظ بربادی کے

نوٹ: 1 آیات۔15۔16 میں آسمان اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد آیات۔17۔18۔ میں زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔سب سے پہلے زمین کی سب سے اشرف مخلوق یعنی انسان کو لیا ہے۔فرمایا کہ اللہ نے تمہیں زمین سے اگایا اور اگانے کے بعد پھر اسی میں

تمہیں مرنے کے بعد لوٹا دیتا ہے۔ اور پھر اسی سے تمہیں ایک دن نکالے گا۔ یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اس آیت میں جو دعویٰ ہے وہی اس دعوے کی نہایت واضح دلیل بھی ہے۔ اس کے مفہوم کو کھول دیجئے، تو بات یوں ہوگی کہ جس طرح زمین سے سبزہ اگتا ہے، اسی طرح اللہ نے تمہیں بھی اسی زمین سے اگایا ہے۔ اور جس طرح زمین سے اگنے والی چیزیں فنا ہو کر زمین میں مل جاتی ہیں، اسی طرح تم بھی مر کر زمین میں مٹی بن جاتے ہو۔ پھر جس طرح تم دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے فنا شدہ سبزوں کو از سر نو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح جب چاہے گا تمہیں بھی بغیر کسی زحمت کے اٹھا کھڑا کرے گا۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔23۔ میں جن پانچ بتوں کا ذکر ہے ان کے متعلق امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں دراصل اللہ کے نیک وصالح بندے تھے جو حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیانی زمانے میں گزرے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے معتقد اور پیروکار تھے اور عرصہ دراز تک لوگوں نے انہیں کے نقش قدم پر عبادت اور اللہ کے احکام کی اطاعت جاری رکھی۔ پھر شیطان نے ان کو سمجھایا کہ تم اپنے جن بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے عبادت کرتے ہو، اگر عبادت کے وقت ان کی تصویریں سامنے رکھ لیا کرو تو تمہاری عبادت بڑی مکمل ہو جائے گی اور تم کو خشوع و خضوع حاصل ہوگا۔ لوگ اس کے فریب میں آ گئے اور بزرگوں کے مجسمے بنا کر عبادت گاہ میں رکھنے لگے۔ مجسموں کو دیکھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہو جانے سے ایک خاص کیفیت محسوس کرنے لگے، یہاں تک کہ اسی حال میں یہ لوگ یکے بعد دیگرے مر گئے۔ جب نئی نسل نے ان کی جگہ لی تو شیطان نے ان کو یہ پڑھایا کہ تمہارے بزرگوں کے خدا اور معبود یہی بت تھے اور وہ انہی کی عبادت کرتے تھے۔ یہاں سے بت پرستی شروع ہوگئی۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔25۔ کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی خطاؤں، کفر و شرک کی وجہ سے پانی میں غرق کیے گئے تو آگ میں داخل ہو گئے۔ یہ متضاد عذاب کہ ڈوبے پانی میں اور نکلے آگ میں، حق تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں جہنم کی آگ تو مراد نہیں ہے کیونکہ اس میں داخلہ تو قیامت کے حساب کتاب کے بعد ہوگا۔ یہ برزخی آگ ہے جس میں داخل ہونے کی قرآن کریم نے خبر دی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ میں رہنے کے زمانے میں بھی مردوں پر عذاب ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قبر میں بدعمل کو عذاب ہوگا تو نیک عمل والوں کو ثواب اور نعمت بھی ملے گی۔ احادیث متواترہ میں قبر کے اندر عذاب وثواب ہونے کا بیان اس کثرت اور وضاحت سے آیا ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس پر امت کا اجماع ہے۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الجن (72)

آیت نمبر (1 تا 9)

ج ر س

حَرْسًا حفاظت کرنا۔ پہرہ دینا۔

حَارِسٌ ج حَرَسٌ۔ فَاعِلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ حفاظت کرنے والا۔ چوکیدار۔ پہرے دار۔

حَرَسِیٌّ ج حَرَسٌ۔ اسم الجمع ہے۔ محافظوں کا دستہ۔ باڈی گارڈوں کا دستہ۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔

ترکیب

آیات۔1۔3۔4۔6۔ میں اَنَّہٗ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان ضمیروں کا کوئی مرجع نہیں ہے، اس لیے یہ سب ضمیر الشان ہیں۔ دیکھیں آیت۔2/85، نوٹ۔1) یہاں پر لفظ قُرْاٰنًا، کلام اللہ کے اسم علم کے طور پر نہیں بلکہ اپنے لغوی معنی میں آیا ہے، دیکھیں

آیت۔2/البقرۃ:185۔مادہ ''ق ر ء''۔(آیت۔5) یہاں تَقُوْلَ واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ فاعل اگر اسم ظاہر ہو تو فعل ہمیشہ واحد آتا ہے، البتہ جنس میں اس کا صیغہ اسم ظاہر کی جنس کے مطابق ہوتا ہے۔لیکن اگر اسم ظاہر عاقل کی جمع مکسر ہو یا اسم الجمع ہو یا مؤنث غیر حقیقی ہو، تو پھر فعل واحد مذکر اور واحد مؤنث، دونوں طرح سے لانا جائز ہے۔یہاں اَلْاِنْسُ وَالْجِنُّ اسم الجمع ہیں اس لیے واحد مؤنث کا صیغہ بھی جائز ہے۔(آیت۔6) فَزَادُوْهُمْ میں زَادُوْا کی ضمیر فاعلی رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ کے لیے بھی ہوسکتی ہے اور رِجَالٌ مِّنَ الْجِنِّ کے لیے بھی۔اسی طرح هُمْ کی ضمیر مفعولی کو بھی دونوں میں سے کسی کے لیے بھی ماننے کی گنجائش موجود ہے۔دونوں مؤنث کی ضمیر سے آتی ہے۔یہاں هُمْ کی ضمری اَنَّ کا اسم ہے اور ظَنُّوْا جملہ فعلیہ بن کر اَنَّ کی خبر ہے اور هُمْ کی ضمیر انسانوں کے لیے ہے بَعَثَ کا اصل مفہوم ہے کسی کو اٹھا کر کسی طرف بھیجنا۔اس لیے یہ لفظ اٹھانا اور بھیجنا، دونوں معانی میں آتا ہے۔یہاں لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کسی کو قبر سے نہیں اٹھائے گا اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ اب کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔دونوں ترجمے درست ہوں گے۔

ترجمہ

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ	اَنَّهُ	اسْتَمَعَ نَفَرٌ	مِّنَ الْجِنِّ
آپ کہیے وحی کیا گیا میری طرف	کہ حقیقت یہ ہے کہ	دھیان سے سنا ایک ایسی ٹولی نے جو	جنوں میں سے تھی

فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا	قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ①	يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ
پھر انہوں نے کہا بیشک ہم نے سنا	ایک عجیب پڑھی جانے والی چیز	جو ہدایت دیتی ہے نیک راہ کی طرف

فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ	وَلَنْ نُّشْرِكَ	بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ②	وَّ اَنَّهٗ
تو ہم ایمان لائے اس پر	اور ہم ہرگز شریک نہیں کریں گے	اپنے رب کے ساتھ کسی ایک کو (بھی)	اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ

تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا	مَا اتَّخَذَ	صَاحِبَةً	وَّلَا وَلَدًا ۙ③
بلند ہوئی ہمارے رب کی عظمت	اس نے نہیں بنایا	کوئی ساتھی (بیوی)	اور نہ کوئی اولاد

وَّ اَنَّهٗ	كَانَ يَقُوْلُ	سَفِيْهُنَا	عَلَى اللّٰهِ	شَطَطًا ۙ④	وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ
اور یہ کہ سچ یہ ہے کہ	کہا کرتا تھا	ہم میں کا بیوقوف (سردار)	اللہ پر (باتیں)	حد سے گزرتے ہوئے	اور یہ کہ ہم نے گمان کیا

اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ	الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ⑤	وَّ اَنَّهٗ	كَانَ رِجَالٌ	مِّنَ الْاِنْسِ
کہ ہرگز نہیں کہیں گے	انسان اور جن	اللہ پر کوئی جھوٹ	اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ	تھے کچھ ایسے مرد	انسانوں میں سے

يَعُوْذُوْنَ	بِرِجَالٍ	مِّنَ الْجِنِّ	فَزَادُوْهُمْ
جو پناہ پکڑتے تھے	کچھ ایسے مردوں کی جو	جنوں میں سے تھے	تو انہوں (انسانوں) نے زیادہ کیا ان (جنوں) کو

رَهَقًا ۙ⑥	وَّ اَنَّهُمْ ظَنُّوْا	كَمَا ظَنَنْتُمْ	اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ
بلحاظ چڑھنے کے	اور یہ کہ ان (انسانوں) نے گمان کیا	جیسے تم (جن) لوگوں نے گمان کیا	ہرگز نہیں اُٹھائے گا اللہ

اَحَدًا ﴿۲۶﴾	وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ	فَوَجَدْنٰهَا	مُلِئَتْ ﴿۲۷﴾ 6940
کسی ایک کو (بھی قبر سے)	اور یہ کہ ہم نے بیشک چھوا (ٹٹولا) آسمان کو	تو ہم نے پایا اس کو	(کہ) اس کو بھر دیا گیا

حَرَسًا شَدِيْدًا	وَّ شُهُبًا ﴿۸﴾	وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ	مِنْهَا مَقَاعِدَ
بڑے سخت محافظوں کے دستوں سے	اور انگاروں سے	اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے	اس (آسمان) میں بیٹھنے کی جگہوں (مورچوں) پر

لِلسَّمْعِ ؕ	فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ	يَجِدْ لَهٗ	شِهَابًا رَّصَدًا ﴿۹﴾
سننے کے لیے	پس جو (کوئی) سنتا ہے اب	تو وہ پاتا ہے اپنے لیے	ایک گھات میں بیٹھنے والا انگارہ

نوٹ: 1

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ جنوں کی حقیقت کیا ہے تا کہ ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پرانے زمانے کے اوہام میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس طرز فکر سے متاثر ہیں، مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے، انہوں نے جن، ابلیس اور شیطان کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو، بلکہ کہیں تو اس سے مراد انسان کی اپنی بہیمی قوتیں ہیں جنہیں شیطان کہا گیا ہے اور کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے لیکن قرآن مجید کے ارشادات اس معاملہ میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ ان تاویلات کے لیے ان کے اندر کوئی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن میں بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ سورۂ رحمن تو پوری کی پوری اس پر ایسی صریح شہادت دیتی ہے کہ جنوں کو انسانوں کی کوئی قسم سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی۔ اعراف۔12، فجر۔26۔27، رحمٰن۔14۔15 میں صاف صاف بتایا گیا کہ انسان کا مادۂ تخلیق مٹی ہے اور جنوں کا مادۂ تخلیق آگ ہے۔ سورۃ حجر۔27۔ میں صراحت کی گئی کہ جن انسان سے پہلے پیدا کیے گئے اسی بات پر قصہ آدم و ابلیس شہادت دیتا ہے جو قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔ پھر سورۂ کہف۔ 50۔ میں بتایا گیا کہ ابلیس جنوں میں سے ہے۔ سورۂ اعراف۔ 27۔ میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ جن انسانوں کو دیکھتے ہیں مگر انسان ان کو نہیں دیکھتے۔ سورۃ حجر۔16 تا 18، سورۂ صافات۔6 تا 10، اور سورۂ ملک۔5 میں بتایا گیا ہے کہ جن عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔ اس سے مشرکین کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں۔ اسی خیال کی تردید سورۂ سبا۔14۔ میں بھی کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ۔30 تا 34۔ اور سورۂ کہف۔50۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلافت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اور انسان جنوں سے افضل مخلوق ہے اگرچہ بعض غیر معمولی طاقتیں جنوں کو بھی بخشی گئی ہیں، جن کی ایک مثال سورۂ نمل۔7۔ میں ملتی ہے۔ لیکن اس طرح بعض طاقتیں حیوانات کو بھی انسان سے زیادہ ملی ہیں اور وہ اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ جانوروں کو انسان پر فضیلت حاصل ہے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک بااختیار مخلوق ہے اور اس کو کفر و ایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ابلیس کی تخلیقِ آدم کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ نوع انسانی کو گمراہ کرے گا اور اسی وقت سے شیاطین جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں مگر وہ زبردستی کوئی کام

6940 کرانے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ اس کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں اور بدی وگمراہی کو خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں۔

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جن انسان سے الگ ایک دوسری ہی نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں۔ان کی پراسرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز تصورات قائم کر رکھے ہیں حتیٰ کہ ان کی پرستش تک کر ڈالی ہے۔مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح کھول کر بیان کر دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ج۶،ص۱۰۹تا۱۱۱)

نوٹ:2

آیات۔4۔5 سے مراد یہ ہے کہ ایمان لانے والے جنات نے اب تک شرک وکفر میں مبتلا رہنے کا عذر یہ بیان کیا کہ ہماری قوم کے بے وقوف لوگ اللہ تعالیٰ کی شان میں بے سروپا باتیں کیا کرتے اور ہمیں یہ گمان نہ تھا کہ کوئی انسان یا جن اللہ کی طرف جھوٹی بات کی نسبت کر سکتا ہے اس لیے ان بے وقوفوں کی باتوں میں آکر آج تک ہم کفر وشرک میں مبتلا تھے۔اب قرآن سنا تو حقیقت کھلی۔(معارف القرآن)۔

ان آیات سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ جنات عوام کے طبقہ سے تھے ان کے سردار جس ڈگر پر ان کو چلاتے رہے،اس پر وہ چلتے رہے۔ لیکن جب حقیقت ان پر واضح ہوگئی تو انہوں نے ان کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردنوں سے نکال پھینکا اور اللہ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر چل پڑے۔آنحضرت ﷺ کے واسطہ سے قریش کے عوام کو یہ باتیں اس لیے سنائی گئیں کہ ان کے اندر بھی اپنے احمق لیڈروں کے پھندے سے نکلنے اور اپنی عقل وبصیرت پر اعتماد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

عربی لغت میں لفظ سَمَاءٌ جس طرح آسمان کے لیے بولا جاتا ہے اسی طرح بادل پر بھی لفظ سَمَاءٌ کا اطلاق عام اور معروف ہے۔آیت۔8۔ میں بظاہر سَمَاءٌ سے مراد یہی بادل ہے۔اور جنات لوگوں کا آسمانی خبریں سننے کے لیے آسمان تک جانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ بادلوں تک جاتے تھے اور وہاں سے آسمانی خبریں سنتے تھے۔اس کی دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے۔آپؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ فرشتے عنان سماء میں اترتے ہیں جس کے معنی بادل کے ہیں۔وہاں وہ ان فیصلوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان میں جاری فرمائے ہیں۔یہاں سے شیاطین یہ خبریں چراتے ہیں اور سن کر کاہنوں کے پاس لاتے ہیں اور اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر ان کو بتاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے شیاطین کا آسمانی خبریں سن کر کاہنوں تک پہنچانے کا سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری تھا مگر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت آسمانی وحی کی حفاظت کے لیے اس سلسلہ کو اس طرح بند کر دیا گیا کہ جب کوئی شیطان خبریں سننے کے لیے اوپر آتا تو اس کی طرف شہاب ثاقب کا انگارہ پھینک کر اس کو دفع کر دیا جاتا ہے۔یہی وہ نیا حادثہ تھا جس کی تحقیق حال کے لیے دنیا کی مشرق ومغرب میں جنوں نے وفود بھیجے پھر مقام نخلہ میں رسول اللہ ﷺ سے قرآن سن کر جنوں کے ایک وفد کا ایمان لانا اس سورۃ میں ذکر فرمایا گیا۔یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شہاب ثاقب جس کو عرفِ عام میں ستارہ ٹوٹنا کہتے ہیں، یہ تو دنیا میں قدیم زمانے سے ہوتا آیا ہے، جب کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد نبوی کی خصوصیت ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ شہابِ ثاقب کا وجود تو ابتداء عالم سے ہے مگر اس آتشیں مادہ سے شیاطین کو دفع کرنے کا کام رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے شروع ہوا اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جتنے شہاب ثاقب نظر آتے ہیں، سب سے ہی یہ کام لیا جاتا ہو۔(معارف القرآن)۔

آیت نمبر (10 تا 19)

6940

ھ ر ب

(ن) هَرْبًا تیز چلنا۔ بھاگنا۔ زیر مطالعہ آیت۔12۔

ح ر ی

(ض) حَرْيًا کسی چیز کا گھٹنا۔ کم ہونا۔

(تفعل) تَحَرِّی دو چیزوں میں سے بہتر کو کوشش کر کے حاصل کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ح ط ب

(ض) حَطْبًا (۱) لکڑی چننا۔ (آگ جلانے کے لیے) (۲) چغلی کھانا، افتراء باندھنا۔ (لڑائی کی آگ جلانے کے لیے)۔

حَطَبٌ اسم ذات ہے۔ (۱) ایندھن۔ زیر مطالعہ آیت۔ 15۔ (۲) چغلی۔ ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ (111/اللھب:4) ''چغلی کو اٹھانے یعنی لیے پھرنے والی)۔

غ د ق

(س) غَدَقًا بارش کا خوب برسنا۔ کسی چیز کا وافر ہونا۔ زیر مطالعہ آیت۔16۔

ل ب د

(ن) لُبُوْدًا گھیرنا۔ چمٹنا۔ گھ جانا۔

لِبْدَةٌ ج۔ لِبَدٌ تہہ بہ تہہ جمی ہوئی اون۔ لوگوں کا جوق در جوق جمع ہونے والا گروہ۔ زیر مطالعہ آیت۔19۔

لُبْدَةٌ ج لُبَدٌ۔ شیر کی گردن کے بال جو بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر کسی چیز کی بہتات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ (90/البلد:6) ''وہ کہتا ہے میں نے ہلاک کیا یعنی خرچ کیا ڈھیروں مال۔''

ترکیب

(آیت۔10) لَا نَدْرِیْ کے آگے اَشَرٌّ سے لے کر رَشَدًا تک پورا جملہ نَدْرِیْ کا مفعول ہے۔ اُرِيْدَ ماضی مجہول ہے اور اس کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے شَرٌّ حالت رفع میں ہے (آیت۔16) اَلطَّرِيْقَةِ پر لام تعریف ہے اس کا معو دِ ذہنی صحیح راستہ کو بھی مانا جا سکتا ہے اور غلط راستہ کو بھی، کیونکہ قرآن مجید میں دونوں طرح کی آزمائش کا ذکر ہے۔ سورۃ الانعام کی آیات۔43۔44) میں نافرمانوں پر آخری عذاب نازل کرنے سے پہلے نعمتوں کے تمام دروازے کھولنے کا ذکر ہے اور سورۃ الانبیاء کی آیت۔35۔ میں اس اصول کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک و بد تمام انسانوں کو دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی آزماتا ہے۔ اس لیے یہاں اَلطَّرِيْقَةِ سے صحیح اور غلط دونوں راستے مراد لینا ممکن ہے۔ البتہ اس سے پہلے اَسْتَقَامُوْا آیا ہے اور استقامت کا لفظ عموماً صحیح راستہ کے لیے آتا ہے۔ اس لیے ہماری ترجیح یہ ہے کہ یہاں صحیح راستہ مراد لیا جائے۔ (حافظ احمد یار صاحب)

پیچھے پہلی آیت میں فَقَالُوْٓا سے جنوں کا قول شروع ہوا تھا اور اس کے لیے مسلسل اَنَّا (کہ ہم) سے بات شروع ہوتی رہی ہے اب یہاں اَنَّا (کہ ہم) کے بجائے اَنْ (کہ) آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ آیت پر جنوں کا قول ختم ہو گیا اور اس اَنْ کا تعلق پہلی آیت کے

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ سے ہے۔ (آیت۔19)۔ عَبْدُ اللّٰہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ یَدْعُوْہُ حال ہے۔ یَکُوْنُوْنَ کی ضمیر فاعلی ھُمْ کو مشرکوں کے لیے بھی مانا گیا ہے لیکن سارا ذکر جنوں کا چلا آرہا ہے اس لیے ہماری ترجیح ہے کہ اس کو جنوں کے لیے مانا جائے۔ 6940

ترجمہ

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْٓ	اَشَرٌّ اُرِیْدَ	بِمَنْ فِی الْاَرْضِ	اَمْ اَرَادَ بِھِمْ
اور یہ کہ ہم نہیں جانتے	آیا کسی برائی (عذاب) کا ارادہ کیا گیا	ان کے بارے میں جو زمین میں ہیں	یا ارادہ کیا ان کے بارے میں

رَبُّھُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾	وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ	وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ	كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾
ان کے رب نے کسی بھلی راہ کا	اور یہ کہ ہم میں نیک لوگ (بھی) ہیں	اور ہم میں اس کے علاوہ (بھی) ہیں	ہم تھے مختلف الرّائے طریقوں پر

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ	اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ	اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ	وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ
اور یہ کہ ہم نے گمان کیا (سمجھ لیا)	کہ ہم ہرگز عاجز نہ کرسکیں گے	اللہ کو زمین میں	اور ہم ہرگز عاجز نہ کرسکیں گے اس کو

ھَرَبًا ﴿۱۲﴾	وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا	الْھُدٰٓی	اٰمَنَّا بِهٖ ؕ	فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ
بلحاظ بھاگنے کے	اور یہ کہ جب ہم نے سنا	اِس ہدایت (قرآن) کو	تو ہم ایمان لائے اُس پر	پھر جو ایمان لاتا ہے اپنے رب پر

فَلَا یَخَافُ بَخْسًا	وَّ لَا رَهَقًا ﴿۱۳﴾	وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ
تو وہ خوف نہیں کرتا کسی حق تلفی کا	اور نہ کسی زیادتی کا	اور یہ کہ ہم میں فرمانبرداری کرنے والے (بھی) ہیں

وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ	فَمَنْ اَسْلَمَ	فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا	رَشَدًا ﴿۱۴﴾
اور ہم میں بے انصافی کرنے والے (بھی) ہیں	تو جس نے فرمانبرداری کی	تو ان لوگوں نے پالیا	بھلی راہ کو

وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ	فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾	وَّ اَنْ
اور وہ جو ناانصافی کرنے والے ہیں	تو وہ لوگ جہنم کے ایندھن ہیں	اور (وحی کیا گیا میری طرف) کہ

لَّوِ اسْتَقَامُوْا	عَلَى الطَّرِیْقَةِ	لَاَسْقَیْنٰهُمْ	مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾
اگر وہ لوگ استقامت اختیار کرتے	اس (سیدھے) راستے پر	تو ہم ضرور پینے کے لیے دیتے ان کو	وافر پانی

لِّنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ	وَمَنْ یُّعْرِضْ	عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ	یَسْلُكْهُ
تاکہ ہم آزمائیں ان کو اس (پانی کے استعمال میں)	اور جو اعراض کرے گا	اپنے رب کی یاد سے	تو وہ (رب) ڈال دے گا اس کو

عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾	وَّ اَنَّ	الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ	فَلَا تَدْعُوْا
ایک چڑھائی والے (مسائل والے) عذاب میں	اور (وحی کیا گیا) کہ	تمام سجدہ گاہیں اللہ کے لیے ہیں	پس تم لوگ مت پکارو

مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾	وَّ اَنَّهٗ	لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ
اللہ کے ساتھ کسی ایک کو	اور حقیقت یہ ہے کہ	جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ

یَدْعُوْهُ	كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ	عَلَیْهِ	لِبَدًا ﴿۱۹﴾
اس کو پکارتے ہوئے	لگتے تھے کہ وہ (جن) ہو جائیں گے	اس (بندے) پر	گھیرا ڈالنے والے گروہ در گروہ

نوٹ:1

اس (آیت۔10) سے معلوم ہوا کہ عالمِ بالا میں اس قسم کے غیر معمولی انتظامات (جس کا ذکر گزشتہ آیت میں کیا گیا ہے) دو ہی حالتوں میں کیے جاتے تھے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر کوئی عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا ہو اور منشائے الٰہی یہ ہو کہ اس کے نزول سے پہلے جن اس کی بھنک پا کر اپنے دوست انسانوں کو خبردار نہ کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے زمین میں کسی رسول کو مبعوث فرمایا ہو اور تحفظ کے ان انتظامات سے مقصود یہ ہو کہ رسول کی طرف جو پیغامات بھیجے جا رہے ہیں، ان میں نہ تو شیاطین کسی قسم کی خلل اندازی کر سکیں اور نہ قبل از وقت یہ معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کو کیا ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پس جنوں کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے آسمان میں یہ چوکی پہرے دیکھے تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی فکر ہوئی کہ ان دونوں صورتوں میں سے کون سی صورت درپیش ہے۔ اسی تلاش میں ہم نکلے تھے کہ ہم نے وہ حیرت انگیز کلام سنا اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ نے خلق خدا کو راہِ راست دکھانے کے لیے ایک رسول مبعوث فرمایا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔ 11۔ کا مطلب یہ ہے کہ اب تک تو نیکی اور بدی کے درمیان ہماری نگاہوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ برے اور بھلے دونوں ہماری نظروں میں یکساں تھے لیکن اس قرآن نے ہمارا یہ مغالطہ دور کر دیا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہمارے طریقے اور راہیں الگ الگ ہیں اور ضروری ہے کہ ہم اس فرق کو ملحوظ رکھ کر لوگوں کے ساتھ معاملہ کریں۔ ہمارے درمیان وصل و فصل کی بنیاد ایمان و کفر کو ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو ہمارے قبیلہ کا ہے وہ ہمارا ہے، چاہے کافر ہو یا مومن، نیک ہو یا بد۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

مفتی محمد شفیعؒ کے ایک کتابچے ''ذکر اللہ'' کے مطابق ذکر۔ ورد۔ تسبیح وغیرہ ذکر اللہ نہیں ہیں بلکہ ذریعہ ذکر ہیں یعنی یہ بندے کو ذکر اللہ کی منزل تک پہنچانے کے ذرائع ہیں۔ ذکر۔ ورد۔ تسبیح وغیرہ میں اللہ کو یاد کرنے والے کلمات کی تکرار کرتے ہوئے جب بندہ اُس مقام پر پہنچ جائے کہ زندگی کی گہما گہمی کے بیچ منجدھار میں معاملات کرتے وقت اسے اللہ کے احکام یاد آنے لگیں اور وہ ان کے مطابق معاملات کرے، تو یہ ذکر اللہ ہے۔ اس بات کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی نماز، روزہ (نفلی) وغیرہ کم ہوں اور جس نے احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ اس کی نماز، روزہ (نفلی) تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔ (آیت۔20/طٰہٰ:152، نوٹ۔1)

اس حوالہ سے اب اس بات کو سمجھ لیں کہ زیر مطالعہ آیت۔ 17۔ میں ذِكْرِ رَبِّهٖ سے مراد یہی ذکر اللہ ہے، تسبیحات وغیرہ نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص فرض نماز، روزوں وغیرہ کا اہتمام تو کرتا ہے لیکن ذکر، ورد، تسبیح وغیرہ کا اہتمام نہیں کرتا تو وہ اس کے اضافی ثواب سے محروم رہے گا، لیکن اس بنیاد پر وہ عذاب کا مستحق نہیں ہوگا۔ عذاب کا مستحق تو وہ ہوگا جس نے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی، اگرچہ اس کی نماز، روزے، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

اللہ کی یاد سے یعنی اس کی قائم کردہ حدود و قیود سے اعراض کرتے ہوئے یعنی کنّی کتراتے ہوئے زندگی بسر کرنے والے کی نقد سزا یہ ہے کہ اسے اسی دنیا میں عَذَابًا صَعَدًا میں جھونک دیا جاتا ہے۔ صَعِدَ۔ يَصْعَدُ کے معنی ہیں سیڑھی پر چڑھنا۔ چڑھائی چڑھنا۔ اس میں آدمی بلند سے بلند تر سطح پر پہنچتا رہتا ہے، اس لیے اس میں ترقی پذیری کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور چڑھائی چڑھنا مشقت طلب کام بھی ہے اس لیے اس میں مشکل کا مفہوم بھی ہے۔ لیکن یہاں عَذَابًا صَعَدًا کا واضح مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس کی زندگی الجھنوں، پریشانیوں اور مسائل کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک پریشانی آتی رہتی ہے اور اسے زندگی میں اطمینان و سکون نصیب نہیں ہوتا اور اس کی زندگی ہانپتے کانپتے ہی بسر ہوتی ہے۔ پھر جب اس دنیا میں آنکھ بند ہوتی ہے اور اُس دنیا میں کھل جاتی ہے تو اس عذاب کی چوٹی سامنے آجاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی اور حساب و کتاب کے وقت حسرت اور کیفیات۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر قسم کے عذاب سے اپنی پناہ میں رکھے۔

آیت نمبر (20تا28)

6940

ترکیب

(آیت۔22) مُلْتَحَدًا باب افتعال سے اسم المفعول ہے جو یہاں اسم الظرف کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (آیت۔23) بَلٰغًا اور رِسٰلٰتِہٖ، یہ دونوں لَنْ اَجِدَ مُلْتَحَدًا سے مستثنیٰ ہیں اور یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ اس لیے یہ دونوں حالتِ نصب میں ہیں۔ (دیکھیں آیت۔ 2/البقرۃ:34،نوٹ۔1) (آیت۔25۔26) رَبِّیْ پر یائے متکلم ہے اس لیے اس کی رفع ،نصب ختم ہوگئی ہے۔ اس آیت میں یہ یَجْعَلُ کا فاعل ہونے کی وجہ سے حالت رفع میں ہے۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ اس کا بدل ہے اس لیے عٰلِمُ حالت رفع میں آیا ہے۔

ترجمہ

قُلْ اِنَّمَآ	اَدْعُوْا رَبِّیْ	وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾
آپ ؐ کہہ دیں کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	میں پکارتا ہوں اپنے رب کو	اور میں شریک نہیں کرتا اس کے ساتھ کسی ایک کو

قُلْ اِنِّیْ	لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ	ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾
آپ ؐ کہہ دیں کہ میں	اختیار نہیں رکھتا تم لوگوں کے لیے	کسی تکلیف کا اور نہ کسی بھلی راہ کا

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ	مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ	وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ
آپ ؐ کہیے کہ ہرگز نہیں بچائے گا مجھ کو	اللہ سے کوئی ایک بھی	اور میں ہرگز نہیں پاؤں گا اس کے علاوہ

مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾	اِلَّا بَلٰغًا	مِّنَ اللّٰهِ	وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ
کوئی پناہ گاہ	سوائے اس کے کہ پہنچانا (حق کو)	اللہ (کی طرف) سے	اور اس کے پیغامات کو

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ	خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ	اَبَدًا ﴿۲۳﴾
اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی	تو یقیناً اس کے لیے ہی جہنم کی آگ ہے	ایک حالت میں رہنے والے اس میں	ہمیشہ ہمیش

حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا	مَا یُوْعَدُوْنَ	فَسَیَعْلَمُوْنَ	مَنْ اَضْعَفُ	نَاصِرًا
یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے	اس کو جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے	تو وہ لوگ جان لیں گے	کہ کون زیادہ ضعیف ہے	بلحاظ مددگار کے

وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾	قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ	اَقَرِیْبٌ	مَّا تُوْعَدُوْنَ	اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ
اور زیادہ قلیل ہے بلحاظ گنتی کے	آپ ؐ کہیے میں نہیں جانتا	آیا قریب ہے	وہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے	یا مقرر کرے گا اس کے لیے میرا رب

اَمَدًا ﴿۲۵﴾	عٰلِمُ الْغَیْبِ	فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖٓ	اَحَدًا ﴿۲۶﴾
کوئی مدت	جو تمام غیب کا جاننے والا ہے	تو وہ مطلع نہیں کرتا اپنے غیب پر	کسی ایک کو

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى	مِنْ رَّسُوْلٍ	فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ	مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ	وَمِنْ خَلْفِهٖ
سوائے اس کے جس کو اس نے پسند کیا	کسی رسول میں سے	پھر بیشک وہ چلاتا ہے	اس (رسول) کے آگے	اور اس کے پیچھے

رَصَدًا ﴿۲۷﴾	لِّیَعْلَمَ اَنْ	قَدْ اَبْلَغُوْا	رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ
پہرہ دینے والے	تاکہ وہ جان لے کہ	ان لوگوں (فرشتوں اور رسولوں) نے پہنچا دیے ہیں	اپنے رب کے پیغامات

وَ اَحَاطَ بِمَا لَدَیۡہِمۡ	وَ اَحۡصٰی	کُلَّ شَیۡءٍ	عَدَدًا ﴿۲۸﴾ ع 6940
اوراس نے احاطہ کیا اس کا جو ان کے پاس ہے	اور اس نے شمار پورا کیا	ہر چیز کا	بلحاظ گنتی کے

نوٹ:1 آیت۔23۔میں اِلَّا بَلٰغًا کا تعلق آیت۔21۔میں لَاۤ اَمۡلِکُ لَکُمۡ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا اسے بھی مانا گیا ہے، ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میں نہ تمہارے مطالبہ پر تمہیں عذاب دکھا سکتا ہوں اور نہ تمہارے دلوں میں ہدایت اتار سکتا۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ اللہ نے جو پیغام دے کر مجھے بھیجا ہے وہ بے کم وکاست میں تمہیں پہنچا دوں اور اس کے حکموں سے تمہیں آگاہ کر دوں۔(تدبر قرآن)۔

دوسری طرف اِلَّا بَلٰغًا کا تعلق آیت۔22۔میں لَنۡ اَجِدَ مُلۡتَحَدًا سے مانا گیا ہے۔ ایسی صورت میں مطلب یہ ہے کہ تمہارے بُرے بھلے کا اختیار رکھنا تو درکنار، مجھے خود اپنے بُرے بھلے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو مجھے اس سے بچانے والا کوئی نہیں ہے اور اس کی پکڑ سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی پناہ گاہ ہے تو بس یہ ہے کہ میں اپنی ابلاغ کی ذمہ داری کو کماحقہٗ ادا کردوں۔ پھر میں اس کی گرفت سے بچ جاؤں گا اور وہ لوگ پکڑے جائیں گے جو اس کی نافرمانی کریں گے۔(حافظ احمد یار صاحب مرحوم کا کیسٹ ترجمہ قرآن)۔

اس آیت میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر گناہ اور نافرمانی کی سزا ابدی جہنم ہے بلکہ جس سلسلۂ کلام میں یہ بات کہی گئی ہے اس کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے توحید کی جو دعوت دی گئی ہے اس کو جو شخص نہ مانے اور شرک سے باز نہ آئے تو اس کے لیے ابدی جہنم کی سزا ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2 آیت۔25۔میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ جو لوگ آپ کو قیامت کا معین وقت بتلانے پر مجبور کرتے ہیں ان سے کہہ دیں کہ قیامت کا آنا تو یقینی ہے لیکن اس کے واقع ہونے کی صحیح تاریخ اللہ نے کسی کو نہیں بتلائی، اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ روزِ قیامت قریب آچکا ہے یا ابھی کچھ مدت باقی ہے۔ پھر اگلی آیت۔26۔میں اس کی وجہ بتائی کہ قیامت کی تاریخ سے میری بے خبری اس لیے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں بلکہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ یہاں الغیب کا الف لام، استغراقِ جنس کے لیے ہے۔ مقصود اس کلام سے علم غیب کلی، جس سے جہان کا کوئی ذرہ مخفی نہ ہو، کی غیر اللہ کے لیے نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اثبات ہے۔ اُس غیب کلی پر وہ کسی کو غالب وقادر نہیں کرتا کہ کوئی جس غیب کو جب چاہے معلوم کرلے، البتہ منصب رسالت کے لیے جس قدر غیب کا علم کسی رسول کو دینا ضروری ہے وہ ان کو من جانب اللہ بذریعہ وحی دے دیا جاتا ہے اور وہ ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے کہ جب ان پر اللہ کی طرف سے کوئی وحی نازل ہوتی ہے تو اس کے ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ شیاطین اس میں کوئی مداخلت نہ کرسکیں۔ اس میں اوّل تو لفظ ’’رسول‘‘ سے اس غیب کی نوعیت متعین کردی گئی جس کا علم رسول و نبی کو دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو علم غیب رسول و نبی کو دیا جاتا ہے اس کی نوعیت متعین کردی کہ وہ فرشتوں کے ذریعے بھیجا جاتا ہے اور وحی لانے والے فرشتوں کے گرد دوسرے فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس علمِ غیب کا نبی و رسول کے لیے اثبات ہے وہ بعض اور مخصوص علم غیب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ استثناء اصطلاحی لفظوں میں استثناء منقطع ہے۔(معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6940

سورۃ المزمل (73)

آیت نمبر (1 تا 19)

ز م ل

(ن) زَمۡلًا کسی کو سواری پر پیچھے بٹھانا۔
(تفعل) تَزَمَّلًا اور ازَّمَّلَ۔ کپڑے کو اپنے اوپر لپیٹ لینا۔
مُزَّمِّلٌ اسم الفاعل ہے۔ لپیٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔1

ب ت ل

(ن۔ض) بَتۡلًا کسی سے کوئی چیز کاٹ کر الگ کرنا۔
(تفعیل) تَبۡتِیۡلًا کسی سے کوئی چیز کاٹ کر مسلسل الگ رکھنا۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔
(تفعل) تَبَتَّلًا کسی سے کٹ کر الگ ہونا۔ سب ٹوٹ کر اللہ سے لَو لگانا۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔

غ ص ص

(س) غَصَصًا کھانے یا پانی سے گلے میں پھندا لگنا۔ گلے میں اٹکنا۔
غُصَّۃٌ جس سے پھندا لگے۔ اٹکنے والی چیز۔ زیر مطالعہ آیت۔13۔

ك ث ب

کَثۡبًا جمع کرنا۔ اکٹھا کرنا۔ (متعدی) جمع ہونا۔ اکٹھا ہونا۔ (لازمی)
کَثِیۡبٌ فَعِیۡلٌ کا وزن ہے۔ دائمی طور پر اکٹھا ہونے والا۔ ریت کا ٹیلا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ھ ی ل

(ض) ھَیۡلًا مٹی ڈالنا۔ مٹی بکھیرنا۔
مَہِیۡلٌ مَفۡعُوۡلٌ (اجوف یائی میں مَفِیۡلٌ) کے وزن پر صفت ہے۔ بکھیری ہوئی۔ بھربھری مٹی۔ زیر مطالعہ آیت۔14

ترکیب

(آیت۔2)۔قُمِ ثلاثی مجرد سے فعل امر ہے، جو کہ لازم ہے، اس کا مفعول نہیں آتا۔ اس لیے اَلَّیۡلَ ظرف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ (آیت۔3۔4) قَلِیۡلًا کا بدل ہونے کی وجہ سے نِصۡفَہٗ حالت نصب میں ہے اور اس میں ہٗ کی ضمیر اَلَّیۡلَ کے لیے ہے۔ اُنۡقُصۡ مِنۡہُ اور زِدۡ عَلَیۡہِ کی ضمیریں نِصۡفَہٗ کے لیے ہیں۔ (آیت۔8) تَبَتَّلۡ باب تفعیل کا فعل امر ہے۔ اس کے مفعول مطلق کے طور پر باب تفعیل کا مصدر تَبۡتِیۡلًا آیا ہے لیکن یہ معروف نہیں بلکہ مجہول کے معنی میں ہے۔ (آیت۔14) کَانَتِ کا اسم اَلۡجِبَالُ ہے جو کہ جمع ہے لیکن اس کے خبر کَثِیۡبًا مَّہِیۡلًا واحد لائی گئی ہے۔ یہ اسلوب اس حقیقت کی تاکید کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ بلا استثناء ہر ایک پہاڑ کَثِیۡبًا مَّہِیۡلًا ہوگا۔ مَہِیۡلٌ مادہ ''م ھ ل'' سے فَعِیۡلٌ کا وزن نہیں ہے بلکہ یہ مادہ ''ھ ی ل'' کا اسم المفعول ہے۔ یہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ اجوف

یائی کا اسم المفعول، مَفْعُوْلٌ کے وزن پر بھی آتا ہے اور مَفِیْلٌ کے وزن پر بھی جیسے مَبِیْعٌ (دیکھیں آسان عربی گرامر۔ حصہ سوم۔ پیراگراف۔۵:۷۲)۔ یہ مَفِیْلٌ کے وزن پر ہے۔ (آیت۔۱۸) اَلسَّمَآءُ مبتدا ہے۔ اس کی خبر مُنْفَطِرَةٌ مؤنث کے بجائے مذکر مُنْفَطِرٌ آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں اَلسَّمَآءُ عام طور پر مؤنث استعمال ہوتا ہے لیکن چند قبیلے اس کو مذکر استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے عربی میں اس کا مؤنث اور مذکر، دونوں استعمال درست مانا جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے لکھنؤ والے دہی کو کھٹی کہتے ہیں اور دہلی والے کھٹا کہتے ہیں۔ دونوں اہل زبان ہیں۔ اس لیے اردو میں دہی کا مذکر اور مؤنث دونوں استعمال درست مانا جاتا ہے۔

ترجمہ

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ①	قُمِ الَّيْلَ	اِلَّا قَلِيْلًا ۙ②	نِّصْفَهٗٓ
اے کپڑا لپیٹنے والے	آپؐ کھڑے رہیں رات کے وقت	سوائے تھوڑے (وقت) کے	جو اس (رات) کا آدھا ہے

اَوِ انْقُصْ	مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ③	اَوْ زِدْ عَلَيْهِ
یا آپؐ (چاہیں تو) گھٹائیں	اس (نصف) میں سے تھوڑا سا	یا آپؐ (چاہیں تو) زیادہ کریں اس (نصف) پر

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ	تَرْتِيْلًا ۚ④	اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ	قَوْلًا ثَقِيْلًا ⑤
اور آپؐ ترتیل سے پڑھیں قرآن کو	جیسا ترتیل کا حق ہے	بیشک ہم ڈالیں گے آپؐ پر	ایک وزنی قول

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ	هِيَ اَشَدُّ	وَطْاً	وَّ اَقْوَمُ قِيْلًا ۚ⑥	اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ
بیشک رات کا سو کر اٹھنا	یہ زیادہ سخت ہے	بلحاظ پامال کرنے کے	اور زیادہ سیدھی ہے بلحاظ بات کے	بیشک آپؐ کے لیے دن میں

سَبْحًا طَوِيْلًا ۚ⑦	وَاذْكُرِ	اسْمَ رَبِّكَ	وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ	تَبْتِيْلًا ۚ⑧
طویل مصروفیت ہے	اور آپؐ ذکر کریں	اپنے رب کے نام کا	اور سب سے الگ ہو کر آپؐ لو لگائیں	جیسا مسلسل الگ کیے جانے کا حق ہے

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	فَاتَّخِذْهُ	وَكِيْلًا ⑨
وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے	کوئی الٰہ نہیں سوائے اس کے	تو آپ! بنائیں اس کو	کام (بگڑی) بنانے والا

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا	يَقُوْلُوْنَ	وَاهْجُرْهُمْ	هَجْرًا جَمِيْلًا ⑩	وَذَرْنِيْ
اور آپؐ صبر کریں اس پر جو	یہ لوگ کہتے ہیں	اور آپؐ چھوڑ دیں ان کو	جیسا خوبصورتی سے چھوڑنے کا حق ہے	اور آپؐ چھوڑیں مجھ کو

وَالْمُكَذِّبِيْنَ	اُولِي النَّعْمَةِ	وَمَهِّلْهُمْ	قَلِيْلًا ⑪	اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا
اور ان جھٹلانے والوں کو	جو خوشحالی والے ہیں	اور آپؐ ڈھیل دیں ان کو	تھوڑی سی	بیشک ہمارے پاس بیڑیاں ہیں

وَّجَحِيْمًا ۙ⑫	وَّطَعَامًا	ذَا غُصَّةٍ	وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۙ⑬	يَوْمَ تَرْجُفُ
اور دہکتی آگ ہے	اور ایک ایسا کھانا ہے جو	گلے میں اٹکنے والا ہے	اور ایک دردناک عذاب ہے	جس دن کانپے گی

الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ	وَكَانَتِ الْجِبَالُ	كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ⑭	اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ
یہ زمین اور سارے پہاڑ	اور ہو جائیں گے پہاڑ	بھربھری ریت کا ٹیلہ	بیشک ہم نے بھیجا تم لوگوں کی طرف

رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ	كَمَآ اَرْسَلْنَآ	اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ﴿۱۵﴾	فَعَصٰى فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ
ایک ایسا رسول جو گواہی دینے والا ہے تم لوگوں پر	جیسے کہ ہم نے بھیجا	فرعون کی طرف ایک رسول	پھر نافرمانی کی فرعون نے اُن رسولؑ کی

فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا ﴿۱۶﴾	فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ	اِنْ كَفَرْتُمْ	يَوْمًا
تو ہم نے پکڑا اس کو ایک سخت پکڑ میں	پھر تم لوگ کیسے بچو گے	اگر تم نے انکار کیا	ایک ایسے دن سے جو

يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ	شِيْبَا ﴿۱۷﴾	السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ	كَانَ وَعْدُهٗ
بنا دے گا بچوں کو	بوڑھا	آسمان پھٹنے والا ہے اس (دن) میں	اس کا وعدہ ہے

مَفْعُوْلًا ﴿۱۸﴾	اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ	فَمَنْ شَآءَ	اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ	سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾
کیا ہوا	بیشک یہ ایک یاددہانی ہے	پھر جو چاہے	وہ بنائے اپنے رب کی طرف	ایک راستہ

نوٹ: 1

ترتیل کا مطلب یہ ہے کہ تیز تیز رواں دواں مت پڑھو بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک ایک آیت پر ٹھہرو تا کہ ذہن پوری طرح کلام الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات وصفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا ذکر ہے تو دل جذباتِ تشکر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی قرأت کا طریقہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ آپؐ الفاظ کو کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا کہ حضور ﷺ ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھہرتے جاتے تھے۔ مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ﴿۱﴾ پڑھ کر رک جاتے، پھر الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۙ﴿۲﴾ پر ٹھہرتے اور اس کے بعد رک کر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴿۳﴾ کہتے۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضور ﷺ کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپ ﷺ کی قراءت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے۔ (تفہیم القرآن)۔

ترتیل میں تحسین صوت یعنی بقدر اختیار خوش آوازی سے پڑھنا بھی شامل ہے۔ (معارف القرآن)۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ قرآن لحن اور لَے سے پڑھتے تھے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 2

آیت۔5۔ میں اس عظیم مقصد کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے قیام لیل کی یہ ہدایت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس بھاری بات کے تحمل کے لیے ایک پیشگی ریاضت اور تیاری کے طور پر یہ حکم ہوا، اس بھاری بات سے کیا مراد ہے، اس کے جواب میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ زیادہ قرین قیاس رائے یہ ہے کہ اس سے مراد اندازِ عام ہے جس کا حکم اگلی سورہ میں قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ﴿۲﴾ اور اس کے بعد جہادِ عظیم کی تیاری کے لیے دیا گیا جس سے آپؐ کو صحابۂ کرامؓ کو اقامت دین کی راہ میں سابقہ پیش آنے والا تھا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس کو دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کے لیے دوسرے وسائل و ذرائع کے فراہم ہونے سے پہلے معرفتِ رب، مستحکم ایمان، غیر متزلزل ایمان اور اپنے رب پر کامل اعتماد و توکل ضروری ہے۔ ان اوصاف کے حصول کا واحد ذریعہ نماز، اور بالخصوص شب کی نماز ہے۔ اسی چٹان پر اقامتِ دین کی جدوجہد کی بنیاد ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 3

چھوڑنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک چھوڑنا تو وہ ہے جو لعن طعن کے بعد فساد و انتقام کے جذبے کے ساتھ ہو اس طرح کا چھوڑنا عام دنیاداروں کا شیوہ ہے۔ انبیاء و صالحین یہ شیوہ اختیار نہیں کرتے۔ وہ خلق کی اصلاح کی کوشش اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی ہدایت اور اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ لوگ ان کی دل آزاری اور ناقدری کرتے ہیں تو انہیں غصہ یا نفرت کے بجائے ان کی محرومی اور بدانجامی پر صدقہ ہوتا ہے۔ وہ ان کے رویہ سے مجبور ہو کر ان کو چھوڑتے تو ہیں لیکن یہ چھوڑنا اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک شریف باپ اپنے نالائق بیٹے کے رویہ پر خاموشی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح کے چھوڑنے کو یہاں هَجْرًا جَمِيْلًا سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس طرح کی علیحدگی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔ جن کے اندر خیر کی کوئی رمق ہوتی ہے وہ اس شریفانہ طرز عمل سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے رویہ کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

آیت نمبر (20)

ترکیب

ثُلُثَيِ دراصل ثُلُثَانِ تھا۔ اس پر مِنْ داخل ہوا تو یہ حالت جر میں ثُلُثَيْنِ ہو گیا۔ پھر یہ اَلَّيْل کا مضاف بنا تو نون اعرابی گر گیا اور یہ ثُلُثَيِ استعمال ہوا۔ نِصْفَهٗ اور ثُلُثَهٗ ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں اور ان کی ہٗ کی ضمیریں اَلَّيْلِ کے لیے ہیں۔ تُحْصُوْهُ میں ہٗ کی ضمیر قِيَامُ الَّيْل کے لیے ہے۔ اَنْ مضارع کو نصب دیتا ہے لیکن اگر مضارع پر س آجائے تو پھر اَنْ کا عمل ساقط ہو جاتا ہے۔ اس لیے اَنْ سَيَكُوْنُ آیا ہے۔ مَا تُقَدِّمُوْا کا مَا شرطیہ ہے۔ اس لیے تُقَدِّمُوْا مجزوم ہوا ہے۔ جبکہ تَجِدُوْا جواب شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔ خَيْرًا اور اَعْظَمَ کی نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے۔

ترجمہ

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ	اَنَّكَ تَقُوْمُ	اَدْنٰى	مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ
بیشک آپ کا رب جانتا ہے	کہ آپ کھڑے ہوتے ہیں	زیادہ قریب (تقریباً)	رات کے دو تہائی میں سے

وَنِصْفَهٗ	وَثُلُثَهٗ	وَطَآئِفَةٌ	مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ
اور (کبھی) اس کے آدھے وقت	اور (کبھی) اس کے ایک تہائی وقت	اور ایک گروہ (بھی)	ان لوگوں میں سے جو آپ کے ساتھ ہیں

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ	الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ	عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ
اور اللہ اندازہ مقرر کرتا ہے	رات کا اور دن کا	اس نے جانا کہ تم لوگ ہرگز نہ نباہ سکو گے اس (قیام الیل) کو

فَتَابَ عَلَيْكُمْ	فَاقْرَءُوْا	مَا تَيَسَّرَ	مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ
تو اس نے شفقت کی تم پر	پس تم لوگ قرأت کرو	اتنی جتنی آسان ہو	قرآن میں سے

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ	مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ	وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ	يَبْتَغُوْنَ
اس نے جانا کہ ہوں گے	تم میں سے کچھ مریض	اور کچھ دوسرے سفر کریں گے زمین میں	تلاش کرتے ہوئے

مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ	وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ	فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ
اللہ کے فضل میں سے (روزی)	اور کچھ دوسرے قتال کریں گے	اللہ کی راہ میں	تو قرأت کرو اتنی جتنی آسان ہو اس میں سے

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ	وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ	قَرْضًا حَسَنًا ؕ	وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ
اور قائم کرو نماز کو	اور پہنچاؤ زکوٰۃ کو	اور قرض دو اللہ کو	ایک خوبصورت قرضہ	اور جو تم لوگ آگے بھیجو گے اپنے آپ کے لیے

مِّنۡ خَيۡرٍ	تَجِدُوۡهُ	عِنۡدَ اللّٰهِ	هُوَ خَيۡرًا	وَّاَعۡظَمَ اَجۡرًا ؕ
کوئی بھی نیکی	تو تم لوگ پاؤ گے اس کو	اللہ کے پاس	وہ بہترین ہوتے ہوئے	اور عظیم ہوتے ہوئے بلحاظ اجر کے

وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ	اِنَّ اللّٰهَ	غَفُوۡرٌ	رَّحِيۡمٌ ﴿۲۰﴾
اور مغفرت مانگو اللہ سے	بیشک اللہ	بے انتہا بخشنے والا	ہمیشہ رحم کرنے والا ہے

نوٹ: 1

یہ آیت جس کے ذریعہ نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی، شروع سورت کی آیات سے ایک سال یا آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی ہے۔ مسند احمد، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اس سورت کے شروع میں قیام اللیل کو فرض کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ اس کی پابندی کرتے رہے۔ سورت کا آخری حصہ اللہ تعالیٰ نے آسمان میں روک رکھا۔ سال بھر کے بعد آخری حصہ نازل ہوا جس میں قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہو کر تخفیف ہوگئی اور اس کے بعد قیام اللیل صرف نفل و مستحب رہ گیا۔ (معارف القرآن)۔

تفہیم القرآن میں اس رائے سے اختلاف کیا گیا ہے کہ یہ آخری آیت سورت کے نزول کے ایک سال بعد مکہ میں نازل ہوئی۔ صاحبِ تفہیم کی رائے ہے کہ یہ آخری آیت سورت کے نزول کے دس سال بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس کی سند میں ایک تابعی حضرت سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ ''پہلے رکوع کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ وہ مکہ معظّمہ میں نازل ہوا ہے۔ اور وہاں بھی اس کا نزول ابتدائی دور میں ہوا ہے جبکہ حضور ﷺ کی نبوت کا آغاز ہونے پر زیادہ سے زیادہ چار سال گزرے ہوں گے۔ بخلاف اس کے یہ دوسرا رکوع اپنے مضامین کی صریح شہادت کے مطابق مدینہ کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے، جب کفار سے جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم بھی آچکا تھا۔''

لیکن میرا ذہن اس دلیل کو قبول کرنے سے معذور ہے۔ اس آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے میرا ذہن اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بی بی عائشہ صدیقہؓ اور حضرت عباسؓ کے اقوال میں اور اس آیت کے مضامین میں کوئی بُعد یا تضاد نہیں ہے۔ میں اپنی رائے نقل کر رہا ہوں تاکہ امانت ادا ہو جائے۔

سورۃ المزمل کے پہلے رکوع کے نزول کے لگ بھگ ایک سال بعد جب یہ آیت نازل ہوئی ہے، اس وقت صورتحال یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ آدھی آدھی رات، ایک ایک تہائی رات اور کبھی دو تہائی رات عبادت میں گزار کر قیام اللیل کے حکم کو نباہ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بات کا آغاز ہی اسی صورتحال کی تحسین سے کیا ہے۔ اور پھر اس حکم میں تخفیف کی وجہ بیان کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس تخفیف کی بنیاد نہ کسی ایسی صورتحال پر تھی جو اس وقت موجود تھی اور نہ کسی ایسے واقعہ پر تھی جو وقوع پذیر ہو چکا تھا بلکہ اس کی بنیاد ایسے حالات و واقعات پر تھی جو مستقبل میں پیش آنے والے تھے اور اللہ کو ان کا علم تھا۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر جب ہم آیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی ابہام کے بغیر بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ قیام اللیل کے فرض کو ابھی تو نباہ رہے ہو لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آگے چل کر تم لوگ اسے ہرگز نہ نباہ سکو گے۔ اس لیے اس حکم کی فرضیت ختم ہے۔ اس کا نعم البدل یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن کا اہتمام کرو۔ جو لوگ رات میں عبادت کے لیے جاگیں ان کے لیے اب نصف شب کے لگ بھگ عبادت کرنا ضروری نہیں ہے۔ جو جتنی دیر آسانی سے عبادت کر سکے اور تلاوت کر سکے وہ کر لے۔ اور جو لوگ رات میں جاگ نہیں سکتے وہ دن میں تلاوت کا خصوصی اہتمام کریں۔

اس کے بعد اُن چند وجوہات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے یہ تخفیف کا حکم دیا گیا تھا۔ اس میں نوٹ کرنے والی بات یہ کہ بات کا آغاز اَنْ یَّکُوْنَ سے نہیں کیا گیا، کیونکہ اس میں حال اور مستقبل دونوں کے معنی ہیں۔ اس کے بجائے بات کا آغاز اَنْ سَیَکُوْنُ سے کیا گیا تا کہ حال کے معنی ختم ہو جائیں۔ اس لیے آیت کے متعلقہ جز کے معنی اب یہ نہیں رہے کہ تم میں کچھ مریض ہو جاتے ہیں کچھ تجارتی سفر کرتے ہیں اور کچھ قتال کرتے ہیں، بلکہ اب معنی صرف یہ رہ گئے کہ تم میں کچھ مریض ہو جائیں گے، کچھ تجارتی سفر کریں گے اور کچھ قتال کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آگے چل کر پیش آنے والے ایسے حالات کے پیش نظر یہ حکم اتارا گیا تھا۔ واضح رہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت بھی لوگ بیمار پڑتے تھے لیکن اس وقت لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ جیسے جیسے انسان مہذب ہوتا جائے گا، اُس کے جسمانی نظام کی قوت مدافعت کمزور ہوتی جائے گی اور نت نئے امراض کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ البتہ اللہ جانتا تھا۔ اس وقت بھی صحابۂ کرامؓ معاشی اور تجارتی کام کرتے تھے لیکن قریش کے تجارتی قافلوں میں ان کی عدم شمولیت کی وجہ سے ان کے تجارتی سفر نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ اور ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ صورتحال کبھی تبدیل ہوگی۔ لیکن اللہ جانتا تھا کہ نہ صرف ان کے تجارتی اسفار میں اضافہ ہونے والا ہے بلکہ ایک وقت وہ بھی آنے والا ہے جب اہل ایمان اندلس سے انڈونیشیا تک، یعنی اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تجارتی سفر کریں گے۔ اس وقت صحابۂ کرامؓ کو قتال کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اللہ جانتا تھا کہ نہ صرف قتال کی اجازت دی جائے گی بلکہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب قتال فرض قرار دیا جائے گا۔ اس طرح مستقبل کی صورت حال کی طرف اشارے کر کے صحابۂ کرامؓ کو تسلی بھی دی گئی اور ان کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ مستقبل کے یہ حالات ایسے یقینی ہیں کہ ان کی وجہ سے تخفیف کا حکم بھی نازل کیا جا رہا ہے۔

اس آیت کے زمانۂ نزول کے متعلق بی بی عائشہ صدیقہؓ اور ابن عباسؓ کے اقوال پر شک کرنے کی دوسری وجہ آیت کا اگلا حصہ ہے جس میں مستقبل کی طرف اشارے کرنے کے بعد پھر قیام اللیل کے نعم البدل یعنی تلاوت قرآن کے ذکر کے ساتھ ہدایت دی گئی کہ نماز قائم رکھو، زکوٰۃ پہنچاتے رہو اور اللہ کو قرضِ حسنہ دیتے رہو۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نماز معراج میں اور زکوٰۃ ہجرت کے بعد فرض ہوئی ہے اس لیے یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ دلیل بھی قابل قبول نہیں ہے۔ معراج میں پانچ وقت کی نمازیں اپنے اوقات کے تعین کے ساتھ فرض ہوئی ہیں لیکن نماز کی ہدایت اس سے پہلے سے موجود تھی۔ مکی صورتوں میں جگہ جگہ واضح الفاظ میں یہ ہدایت موجود ہے۔ بات کو سمجھنے کے لیے اِن شاء اللہ ایک ہی آیت کا حوالہ کافی ہوگا۔ سورہ ھود کی آیت۔ 114۔ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اور آپؐ قائم رکھیں نماز کو دن کے دونوں کناروں پر اور کچھ حصّوں میں رات میں سے۔'' آیت کے اس جز کی تشریح تفہیم القرآن میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ دن کے دونوں سروں پر سے مراد صبح اور مغرب اور کچھ رات گزرنے پر سے مراد عشاء کا وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ارشاد اس زمانے کا ہے جب نماز کے لیے ابھی پانچ وقت مقرر نہیں کیے گئے تھے۔ معراج کا واقعہ اس کے بعد پیش آیا جس میں پنج وقتہ نماز فرض ہوئی۔'' اب کوئی ابہام نہیں رہتا کہ آیت زیر مطالعہ میں اس وقت کی ہدایت کے مطابق نماز قائم کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

اسی طرح سے زکوٰۃ کے قواعد وضوابط کو آخری شکل یقیناً مدینہ میں دی گئی ہے لیکن زکوٰۃ کا حکم پہلے سے موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مکی سورتوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمنون کی پہلی گیارہ آیات میں مومنوں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے آیت نمبر۔ 4۔ میں ہے کہ وہ لوگ زکوٰۃ پر عمل پیرا ہیں۔ اس کی تشریح میں ''ابن کثیر اور دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت مکہ ہی میں ہو چکی تھی۔ مگر سرکاری طور پر اس کے وصول کرنے کا انتظام اور نصابات وغیرہ کی تفصیلات مدینہ جانے کے بعد جاری ہوئیں۔'' (معارف القرآن)

ان وجوہات کی بنا پر میرا ذہن اس پر آمادہ نہیں ہوتا کہ جلیل القدر صحابہ کرام کے اقوال کو چھوڑ کر ایک تابعیؒ کے قول کو ترجیح دی جائے، اور وہ بھی آیات کے زمانۂ نزول کے بارے میں۔

نوٹ:2 مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیج دیا وہ تمہارے لیے اس سے زیادہ نفع بخش ہے جو تم نے دنیا میں روک رکھا اور کسی بھلائی کے کام میں اللہ کی رضا کی خاطر خرچ نہ کیا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ؐ نے پوچھا تم میں سے کون ہے جس کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ فرمایا سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارا حال واقعی یہی ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارا اپنا مال تو وہ ہے جو تم نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیج دیا اور جو کچھ تم نے روک کر رکھا وہ تو وارث کا مال ہے۔ (تفہیم القرآن)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ (74)

آیت نمبر (1 تا 7)

د ث ر

(ن)	دُثُوْرًا	کپڑے کا میلا ہونا۔ بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا۔
(تفعل)	تَدَثُّرًا	اِدَّثَّرًا۔ کپڑا اوڑھنا۔ کپڑے میں لپٹنا۔
	مُدَّثِّرٌ	اسم الفاعل ہے۔ کپڑے میں لپٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔1۔

ترجمہ

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿1﴾	قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿2﴾
اے کپڑے میں لپٹنے والے	آپؐ کھڑے ہوں پھر آپ خبردار کریں (لوگوں کو)

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿3﴾	وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ﴿4﴾
اور اپنے رب کی پھر آپؐ بڑائی بیان کریں	اور اپنے کپڑوں کو پھر آپؐ پاک رکھیں

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ﴿5﴾	وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ﴿6﴾
اور گندگی کو پس آپؐ چھوڑ دیں	اور آپؐ احسان کریں کثرت (بہت معاوضہ) چاہتے ہوئے

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ﴿7﴾
اور اپنے رب کے لیے پھر آپؐ ثابت قدم رہیں

نوٹ:1 آیت۔3۔ میں حکم دیا گیا کہ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے، قول سے بھی اور عمل سے بھی۔ اس جگہ لفظ رب اس لیے اختیار کیا گیا کہ یہ اس

حکم کی علت ہے کیونکہ جو سارے جہان کا پالنے والا ہے صرف وہی ہر بڑائی اور کبریائی کا مستحق ہے (معارف القرآن) انبیاء علیہم السلام کی 6940
دعوت میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے یعنی صرف اللہ ہی کی کبریائی و یکتائی کا اعلان کہ اللہ کے سوا جو بھی کبریائی کے مدعی ہیں یا جن کی کبریائی کا دعوٰی کیا جاتا ہے، وہ سب باطل ہیں۔ ایک جاہلی معاشرہ میں یہ اعلان ساری خدائی سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھا لیکن دین کی بنیاد چونکہ اسی کلمہ پر ہے اس لیے ہر نبی کو بے رنگ یہ اعلان کرنا پڑا۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۔ یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم ولباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم وملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہؐ جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت ونظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لیے ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوع انسانی کو طہارتِ جسم ولباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہل عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو لفظ ''طہارت'' کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے۔

ان الفاظ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو، اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اُجلے کپڑے پہن لیتا تو سمجھا جاتا کہ وہ دنیادار انسان ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی پاکیزہ اور نفیس ہو۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو یعنی لباس صاف ستھرا تو ضرور ہو لیکن اس میں فخر وغرور، شان وشوکت اور نمائش کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔

چوتھا مفہوم یہ ہی کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ متعدد اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

رُجْزٌ ۔ رِجْزٌ ۔ اور رِجْسٌ تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس کا استعمال اُس گندگی کے لیے ہوتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت میں ارتعاش اور گھن پیدا ہو۔ یوں تو اس سے ہر قسم کی گندگی مراد ہوسکتی ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر شرک کی گندگی کے لیے آیا ہے کہ اپنے دامن کو شرک کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شرک کی ناپاکی سے دور رہو۔ اس ہدایت کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ العیاذ باللہ آپؐ کے کسی شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا۔ مقصود صرف کفار ومشرکین کو آگاہ کرنا تھا کہ وہ جان لیں کہ جو خبردار کرنے والا ان کے پاس آیا ہے اس کا موقف ان کے دینِ شرک کے بارے میں کیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے اس باب میں کن ہدایات کے ساتھ مبعوث ہوا ہے (تدبر قرآن)

آیت نمبر (8 تا 25)

6940

ع ب س

(ض) عَبَسًا ترش روئی کرنا۔ تیوری چڑھائی۔ زیر مطالعہ آیت۔22۔

(ض) عَبُوْسٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ صفت کے طور پر آتا ہے۔ انتہائی ترش بدمزاج۔ ﴿ اِنَّا نَخَافُ مِنۡ رَّبِّنَا یَوۡمًا عَبُوۡسًا قَمۡطَرِیۡرًا ﴾ (76/الدھر:10) ''بیشک ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے ایک ایسے دن سے جو انتہائی ترش، بہت شدید ہے۔''

ب س ر

(ن) بُسُوْرًا (۱) منہ بگاڑنا۔ منہ بسورنا۔ (مایوسی سے)۔ (۲) چہرے کا اداس ہونا۔ چہرے کا مرجھانا۔ زیر مطالعہ آیت۔22۔

بَاسِرَۃٌ اسم الفاعل بَاسِرٌ کا مؤنث ہے۔ اداس ہونے والا۔ مرجھانے والا۔ ﴿ وُجُوۡہٌ یَّوۡمَئِذٍۭ بَاسِرَۃٌ ﴾ (75/القیامۃ:24) ''کچھ چہرے اس دن مرجھانے والے ہیں۔''

ترکیب

(آیت۔9۔10) فَذٰلِکَ کا اشارہ گزشتہ آیت میں اِذَا نُقِرَ کی طرف ہے۔ یَوۡمَئِذٍ نکرہ مخصوصہ ہے۔ یَوۡمٌ عَسِیۡرٌ (مرکب توصیفی) اور غَیۡرُ یَسِیۡرٍ (مرکب اضافی) دونوں اس کی خصوصیت ہیں۔ (آیت۔11) ذَرۡ فعل امر کا مفعول نِیۡ کی ضمیر ہے اور مَنۡ خَلَقۡتُ کا مفعول مقدم ہے۔ جبکہ وَحِیۡدًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ اس کو خَلَقۡتُ کی ضمیر فاعلی کا حال بھی مانا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں مطلب ہوگا کہ میں نے تنہا اس کو پیدا کیا۔ اس کام میں کوئی بھی میرا شریک نہیں اور اس کو مَنۡ کا حال مانا جاسکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے دو مطلب ہوں گے۔ ایک یہ کہ ہر انسان (مَنۡ واحد۔ جمع۔ مذکر۔ مؤنث سب کے لیے آتا ہے) ماں کے پیٹ سے اکیلا آتا ہے۔ مال و اولاد اور دیگر ساز و سامان ساتھ نہیں لاتا۔ دوسرا یہ کہ اس کو اپنے ماں باپ کا اکلوتا پیدا کیا، (آیت۔12۔13) جَعَلۡتُ کا مفعول مَالًا اور بَنِیۡنَ ہے۔ شُھُوۡدًا کو جَعَلۡتُ کا تیسرا مفعول بھی مانا جاسکتا ہے ایسی صورت میں مطلب ہوگا موقع پر حاضر رہنے والے یعنی نوکر چاکر، اور اس کو بَنِیۡنَ کا حال بھی مانا جاسکتا ہے۔ (حافظ احمد یار صاحب)۔ ہماری رائے ہے کہ چونکہ بَنِیۡنَ اور شُھُوۡدًا کے درمیان واو عاطفہ نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ شُھُوۡدًا کو بَنِیۡنَ کا حال مانا جائے۔

ترجمہ

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوۡرِ ﴿۸﴾	فَذٰلِکَ یَوۡمَئِذٍ	یَّوۡمٌ عَسِیۡرٌ ﴿۹﴾
پھر جب پھونکا جائے گا بگل میں	تو وہ (واقعہ) ایسے دن ہوگا جو	ایک دشوار دن ہے

عَلَی الۡکٰفِرِیۡنَ غَیۡرُ یَسِیۡرٍ ﴿۱۰﴾	ذَرۡنِیۡ	وَمَنۡ	خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ﴿۱۱﴾
کافروں پر کسی نرمی کے بغیر ہے	آپ چھوڑ دیں مجھ کو	اور اس کو جس کو	میں نے پیدا کیا تنہا ہوتے ہوئے

وَّجَعَلۡتُ لَہٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ﴿۱۲﴾	وَّبَنِیۡنَ شُھُوۡدًا ﴿۱۳﴾	وَّمَھَّدۡتُّ لَہٗ	تَمۡھِیۡدًا ﴿۱۴﴾
اور میں نے بنایا اس کے لیے بڑھایا ہوا مال	اور بیٹے حاضر رہنے والے	اور میں نے ہموار کیا اس کے لیے (راہوں کو)	جیسے ہموار کرتے ہیں

ثُمَّ يَطْمَعُ	اَنْ اَزِيْدَ ﴿۱۵﴾	كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ	لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿۱۶﴾
پھر وہ لالچ کرتا ہے	کہ میں زیادہ کروں	ہرگز نہیں! بیشک وہ تھا	ہماری آیتوں کی مخالفت کرنے والا

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾	اِنَّهٗ فَكَّرَ	وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾
میں مبتلا کروں گا اس کو ایک دشوار چڑھائی میں	بیشک اس نے غور وفکر کیا	اور قدر و قیمت طے کی

فَقُتِلَ	كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾	ثُمَّ
تو مارا جائے (ستیاناس ہو جائے)	کیسی اس نے قیمت طے کی	پھر (I Repeat)

قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾	ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾	ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾
مارا جائے کیسی اس نے قیمت طے کی	پھر اس نے نظر دوڑائی	پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بسورا

ثُمَّ اَدْبَرَ	وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾	فَقَالَ اِنْ هٰذَآ
پھر اس نے پیٹھ پھیری	اور بڑا بنا	تب اس نے کہا نہیں ہے یہ

اِلَّا سِحْرٌ	يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾	اِنْ هٰذَآ اِلَّا	قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾
مگر ایک ایسا جادو جو	نقل کیا جاتا ہے	نہیں ہے یہ مگر	اس بشر کا قول

نوٹ: 1

اس سورۃ میں پہلی سات آیات مکہ معظّمہ کے بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ ہیں۔ سورۃ کا باقی ماندہ حصّہ آیت۔8 سے آخر تک اس وقت نازل ہوا جب اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع ہو جانے کے بعد مکہ میں پہلی مرتبہ حج کا موقع آیا۔ اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمدؐ نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور اجتماعات میں قرآن جیسا مؤثر کلام سنایا تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثر ہو جائے۔ اس لے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی ان کے اندر رسول اللہؐ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اس پر اتفاق رائے ہو گیا تو ولید بن مغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لو جسے سب بالا اتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا قرآن کو کاہنوں سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ نے کہا انہیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا کون باور کرے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانگی کی بڑ ہے یا جنون کے دورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے۔ لوگوں نے کہا اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا کہ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے تو ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا جادوگر اپنے جادو کے لیے جو طریقے اختیار کرتے ہیں، ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی ان پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے، لوگ اسے ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے۔ اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمر دار ہیں۔ اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہو گی جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں

کوئی بات نہ کہو۔ اس نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے۔ یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو باپ۔ بھائی۔ بیوی۔ بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبہ کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وجود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انہوں نے لوگوں کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے، اس سے ہوشیار رہنا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہؐ کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کر دیا۔ یہی واقعہ ہے جس پر اس سورہ کے دوسرے حصّے یعنی آیت۔8۔ سے آخر تک، میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن۔ ج6۔ ص138 تا140 سے ماخوذ)

6940

آیت نمبر (26 تا37)

ترکیب

(آیت۔27) سَقَرُ غیر منصرف ہے اور مؤنث سماعی بھی ہے۔ اس لیے آگے مُبْقِیْ۔ تَذَرُ۔ لَوَّاحَةٌ اس کے لیے مؤنث کے صیغے آئے ہیں اور آگے اس کے لیے ضمیریں بھی مؤنث کی آئی ہیں۔ (آیت۔29) لَوَّاحَةٌ خبر ہے۔ اس کا مبتدا ھِیَ محذوف ہے۔ لِلْبَشَرِ متعلق خبر ہے اور اس پر لام جنس ہے اس لیے اس کا ترجمہ جمع میں ہوگا۔ (آیت۔30) عَلَیْهَا کی ضمیر سَقَرُ کے لیے ہے۔ (آیت۔31) لِیَسْتَیْقِنَ کے لام کَی پر عطف ہونے کی وجہ سے یَزْدَادَ اور یَرْتَابَ، دونوں مضارع حالت نصب میں آئے ہیں کیونکہ لام کَی کے بعد اَنْ مقدر ہوتا ہے۔ وَمَا هِیَ ذِکْرٰی میں هِیَ بھی سَقَرُ کے لیے ہے اور آیت۔ 26۔ سے اس کی جو بات چلی آ رہی ہے اسے ذِکْرٰی کہا ہے۔ (آیت۔35۔36) اِنَّهَا لَاِحْدَی الْکُبَرِ میں اِنَّهَا کی ضمیر بھی سَقَرُ کے لیے ہے اور اَلْکُبَرِ۔ کُبْرٰی کی جمع ہے۔ نَذِیْرًا۔ اِنَّهَا کا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ فَعِیْلٌ کے وزن پر آنے والے اسماء الصفہ میں کبھی مذکر مؤنث میں فرق کرنے کے لیے تائے ثانیث لگاتے ہیں اور کبھی نہیں بھی لگاتے۔ اس لیے یہاں نَذِیْرَةً کے بجائے نَذِیْرًا بھی درست ہے۔

ترجمہ

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ﴿۲۶﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿۲۷﴾	لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ ﴿۲۸﴾
میں ڈالوں گا اس کو جھلسانے والی (دوزخ) میں	اور آپ کیا جانیں کیا ہے جھلسانے والی	وہ باقی نہیں رہنے دیتی اور نہ چھوڑتی ہے

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿۲۹﴾	عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿۳۰﴾	وَمَا جَعَلْنَآ	اَصْحٰبَ النَّارِ
جھلسانے والی ہے انسانوں کو	اس پر انیس (فرشتے) ہیں	اور ہم نے نہیں بنایا (کسی کو)	آگ والے (داروغہ)

اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ص	وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ	اِلَّا فِتْنَةً	لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا
مگر کچھ فرشتوں کو	اور ہم نے نہیں بنایا ان کی گنتی کو	مگر ایک آزمائش	ان کے لیے جنہوں نے کفر کیا

لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ	اُوْتُوا الْكِتٰبَ	وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا	اِیْمَانًا
تا کہ یقین حاصل کریں وہ لوگ جن کو	دی گئی کتاب	اور زیادہ ہوں وہ لوگ جو ایمان لائے	بلحاظ ایمان کے

وَّلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ	اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ	وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ
اور تا کہ شبہہ میں نہ پڑیں وہ لوگ جن کو	دی گئی کتاب اور مومن لوگ	اور تا کہ کہیں وہ لوگ

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	وَّالْكٰفِرُوْنَ	مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ	بِهٰذَا مَثَلًا ؕ
جن کے دلوں میں ایک روگ ہے	اور کافر لوگ	کیا ارادہ کیا اللہ نے	اس (گنتی) سے بطور مثال کے

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ	مَنْ يَّشَآءُ	وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ	وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ
اس طرح پھسلا دیتا ہے اللہ	اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	اور وہ ہدایت دیتا ہے اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	اور نہیں جانتا آپؐ کے رب کے لشکروں کو (کوئی بھی)

اِلَّا هُوَ ؕ	وَمَا هِيَ	اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾	كَلَّا وَالْقَمَرِ ۙ﴿۳۲﴾
مگر وہی	اور نہیں ہے یہ (سقر کی بات)	مگر ایک یاددہانی انسانوں کے لیے	ہرگز نہیں! قسم ہے چاند کی

وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۙ﴿۳۳﴾	وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۙ﴿۳۴﴾	اِنَّهَا	لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۙ﴿۳۵﴾
قسم ہے رات کی جب اس نے پیٹھ پھیری	قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہوتی ہے	بیشک یہ (بات)	یقیناً بہت بڑی باتوں کی ایک ہے

نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۙ﴿۳۶﴾	لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ	اَنْ يَّتَقَدَّمَ	اَوْ يَتَاَخَّرَ ؕ﴿۳۷﴾
خبردار کرنے والی ہوتے ہوئے انسانوں کے لیے	اس کے لیے جو چاہے تم میں سے	کہ وہ آگے بڑھے	یا (چاہے تو) پیچھے رہے

نوٹ: 1

آیت۔30۔ میں ہے کہ دوزخ پر انیس فرشتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے دوزخ کے انتظام پر جو فرشتوں کا لشکر ہوگا اس کے افسر انیس فرشتے ہوں گے۔ جن میں سب سے بڑے ذمہ دار کا نام مالک ہے۔ (دیکھیں آیت۔43۔77، نوٹ۔1) حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے نہایت تفصیل سے انیس کے عدد کی حکمتیں بیان کی ہیں جو قابل دید ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جہنم میں مجرموں کو عذاب دینے کے لیے انیس قسم کے فرائض ہیں۔ جن میں سے ہر فرض کی انجام دہی ایک ایک فرشتے کی سرکردگی میں ہوگی۔ کوئی شبہ نہیں کہ فرشتہ کی طاقت بہت بڑی ہے اور ایک فرشتہ وہ کام کرسکتا ہی جو لاکھوں آدمی مل کے نہیں کرسکتے۔ لیکن یاد رہے کہ ہر فرشتے کی یہ قوت اسی دائرے میں محدود ہے جس کام کے کرنے کے لیے وہ مامور ہوا ہے۔ مثلاً ملک الموت لاکھوں آدمیوں کی جان ایک آن میں نکال سکتا ہے۔ مگر عورت کے پیٹ میں ایک بچے کے اندر جان نہیں ڈال سکتا۔ حضرت جبریلؑ چشم زدن میں وحی لا سکتے ہیں لیکن پانی برسانا ان کا کام نہیں ہے۔ جس طرح کان دیکھ نہیں سکتا، آنکھ سن نہیں سکتی۔ اسی طرح اگر ایک فرشتہ عذاب کے واسطے دوزخیوں پر مقرر ہوتا تو اس سے ایک ہی قسم کا عذاب دوزخیوں پر ہوسکتا ہے۔ دوسری قسم کا عذاب جو اس کے دائرہ استعداد سے باہر ہے ممکن نہ تھا۔ اس لیے انیس قسم کے عذابوں کے لیے، جن کی تفصیل تفسیر عزیزی میں ہے، انیس ذمہ دار فرشتے مقرر ہوئے علماء نے اس عدد کی حکمتوں پر بہت کچھ کہا ہے مگر احقر کے نزدیک حضرت شاہ صاحبؒ کا کلام بہت عمیق ولطیف ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ: 2

اگلی آیت۔31۔ میں دوزخ کے کارکنوں کی تعداد بیان کرنے کی وجہ بیان کرنے کی وجہ بیان کی گئی کہ یہ تعداد اس لئے بیان کی گئی کہ یہ ہر اس شخص کے لیے فتنہ بن جائے جو اپنے اندر کوئی کفر چھپائے بیٹھا ہو۔ اگر وہ خدا کی عظیم قدرتوں کے بارے میں یا وحی ورسالت کے بارے میں شک کا کوئی شائبہ بھی اپنے دل میں رکھتا ہے، تو یہ سنتے ہی کہ خدا کی اتنی بڑی جیل میں بے حد وحساب مجرموں کو صرف 19 سپاہی قابو میں رکھیں گے اور فرداً فرداً ایک ایک شخص کو عذاب بھی دیں گے، تو اس کا کفر فوراً کھل کر باہر آجائے گا۔

دوسری وجہ یہ بتائی گئی کہ اہل کتاب اس سے یقین حاصل کریں گے۔ بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ اہل کتاب کے ہاں چونکہ ان کی کتابوں میں جو دوزخ کے فرشتوں کی یہی تعداد بیان کی گئی ہے اس لیے یہ بات سن کر ان کو یقین آجائے گا کہ یہ

بات فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔لیکن دو وجوہ سے یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔اوّل یہ کہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ دوزخ کے فرشتوں کی تعداد 19 ہے۔دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جو اہل کتاب کی مذہبی کتابوں میں بھی بیان کی گئی ہیں۔لیکن وہ لوگ اس کی یہ توجیہ کر دیتے ہیں کہ محمدؐ نے یہ باتیں ان کی کتابوں سے نقل کر لی ہیں۔ان وجوہ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ محمدؐ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میری زبان سے دوزخ کے انیس فرشتوں کا ذکر سنکر میرا خوب مذاق اڑایا جائے گا۔اس کے باوجود بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی میں بیان ہوئی تھی اسے انہوں نے کسی جھجک کے بغیر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور کسی مذاق استھزاء کی پرواہ نہ کی۔جہلائے عرب تو انبیاء کی اس شان سے ناواقف تھے،مگر اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ انبیاء کا ہر زمانے میں یہی طریقہ رہا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آتا تھا اسے وہ جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔اس بنا پر اہل کتاب سے یہ بات زیادہ متوقع تھی کہ رسول اللہؐ کے اس طرز عمل کو دیکھ کر انہیں یقین آجائے گا کہ ایسے سخت مخالف ماحول میں ایسی بظاہر انتہائی عجیب بات کو کسی جھجک کے بغیر پیش کر دینا ایک نبی ہی کا کام ہوسکتا ہے۔(تفہیم القرآن)

آیت نمبر (38 تا 56)

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ	رَهِيْنَةٌ ﴿٣٨﴾	اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿٣٩﴾
ہر جان،اس میں جو اس نے کمائی کی	گروی رکھی ہوئی ہے	سوائے داہنی طرف والوں کے

فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٤٠﴾	عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٤١﴾	مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿٤٢﴾
(وہ لوگ) باغات میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے	مجرموں کے بارے میں	(پھر مجرموں سے پوچھیں گے) کس چیز نے ڈالا تم کو دوزخ میں

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿٤٣﴾	وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ	الْمِسْكِيْنَ ﴿٤٤﴾	وَكُنَّا نَخُوْضُ
وہ لوگ کہیں گے ہم نہیں تھے نمازیوں میں سے	اور ہم نہیں کھلایا کرتے تھے	مسکینوں کو	اور ہم لاحاصل بحث کیا کرتے تھے

مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿٤٥﴾	وَكُنَّا نُكَذِّبُ	بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤٦﴾	حَتّٰٓى اَتٰىنَا
بحث کرنے والوں کے ساتھ	اور ہم جھٹلایا کرتے تھے	بدلے کے دن کو	یہاں تک کہ آن پہنچا ہمارے پاس

الْيَقِيْنُ ﴿٤٧﴾	فَمَا تَنْفَعُهُمْ	شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾	فَمَا لَهُمْ
وہ یقین (موت)	تو نفع نہیں دے گی ان کو	شفاعت کرنے والوں کی شفاعت	تو انہیں کیا (ہو گیا) ہے

عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾	كَاَنَّهُمْ	حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾
(کہ) اس یاددہانی سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں	(ایسے) جیسے کہ وہ لوگ	بدکنے والے ایسے گدھے ہیں جو

فَرَّتْ	مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾	بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ	اَنْ يُّؤْتٰى
بھاگے	کسی شیر (شیرانِ خدا کی دہشت) سے	بلکہ چاہتا ہے ہر مردان میں سے	کہ اس کو دیئے جائیں

صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾	كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾	كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾
کھولے ہوئے اوراق	ہرگز نہیں بلکہ یہ لوگ خوف نہیں محسوس کرتے آخرت کا	ہرگز نہیں بیشک یہ (قرآن) ایک یاددہانی ہے

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهُ ﴿۵۵﴾	وَمَا يَذْكُرُوْنَ	اِلَّآ اَنْ 6940
تو جو چاہے وہ یاد کرے اس کو	اور وہ لوگ یاد نہیں کریں گے	سوائے اس کے کہ

يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ	هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى	وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾ ع
چاہے اللہ	وہی تقویٰ کیے جانے کا اہل ہے	بخش دینے کا اہل ہے

نوٹ: 1

زیر مطالعہ آیات۔40 تا48۔ میں جن مجرمین کا ذکر ہے ان کے متعلق یہ بات ذہن میں واضح کرلیں کہ یہ ملحدوں یا کافروں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایسے مسلمانوں کا ذکر ہے جو ایمانیات کو مانتے ہیں اور دل سے مانتے ہیں۔ آخرت کا اقرار کرتے ہیں لیکن دنیاوی معاملات میں الجھتے وقت آخرت میں جوابدہی اور حساب کتاب کا خوف محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح آخرت کی تکذیب عملی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے عمل میں کمزور ہیں۔ ٹی۔ وی دیکھ رہے ہیں یا کسی مجلس میں شخصیات پر گرما گرم بحث میں مبتلا ہیں، کسی کی غیبت ہے، کسی پر بہتان ہے یا روزہ رکھا ہوا ہے اور روزہ بہلانے کے لیے کلب میں بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں، ایسے میں اذان کی آواز آجاتی ہے تو جلدی سے اپنا کام روک دیتے ہیں۔ اذان کا جواب دیتے ہیں اذان ختم ہونے کی دعا پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیر کے پھر شروع ہو جاتے ہیں اور نماز پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ البتہ اگر کبھی غیرتِ اسلامی کے مظاہرے کا موقع آجائے تو جلسہ جلوس، مار کٹائی، ڈکیتی اور قتل و غارتگری میں اسلام کی سربلندی کے لیے اس طرح شریک ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود اور رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ہدایات کو پیروں تلے روند کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ اسلام کی خاطر ان کی سرفروشی کو دیکھ کر ہمارے جیسے کچے پکے مسلمان ان کو خود سے بہتر مسلمان سمجھتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے اگر معافی دے کر اپنی رحمت سے ہمیں جنت میں بھیج دیا یا رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے طفیل ہمیں دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا گیا، تو وہاں ہم ایسے سرفروشوں کو تلاش کریں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ وہ جیالے کدھر ہیں، نظر نہیں آتے۔ پھر جب جنت کو چھوڑ کر دوزخ کا جائزہ لیں گے تو وہاں وہ نظر آجائیں گے اور ہم حیران ہو کر پوچھیں گے کہ حضرت آپ یہاں کیسے۔ اس وقت جو مکالمہ ہوگا، آیت۔47۔ تک میں اس کا بیان ہے اور آیت۔48۔ میں ایسے مجرموں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلے کا بیان ہے۔ (مرتب)

وہ جو کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ تھے جنہوں نے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتب کو مان کر خدا کا وہ اوّلین حق ادا کیا ہو جو ایک خدا پرست انسان پر عائد ہوتا ہے یعنی نماز۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک وہ ایمان نہ لایا ہو۔ اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مستلزم ہے۔ لیکن نمازیوں میں سے نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو۔ (تفہیم القرآن)۔

مجرموں کے جواب کا آخری جملہ بہت اہم ہے جس میں انہوں نے کہا ''یہاں تک کہ آن پہنچا ہمارے پاس وہ یقین''، یعنی موت۔ ایک طرف اس میں حسرت ہے کہ قبل اس کے کہ ہم توبہ کرتے اور اپنی اصلاح کرتے، ہمارا وقت پورا ہو گیا اور ہمیں توبہ کا موقع نہیں ملا۔ دوسری طرف اس میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو اس عارضی دنیا میں اہل ایمان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے یعنی توبہ کا دروازہ۔ اور ہمارے لیے یہ ہے کہ کوئی پتہ نہیں توبہ کا دروازہ کب بند ہو جائے اس لیے ہر صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً جائزہ لیتا رہے، اپنے اعمال کی اصلاح کرتا رہے اور محض اپنے ایمان کی پونجی کے بھروسے پر مت بیٹھا رہے۔ اس آیت میں موت کو

الیقین اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دنیا میں جب انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے تو اُس دنیا میں کھل جاتی ہے اور وہاں کی جن جن باتوں کی خبر انسان کو یہاں دی گئی ہے، وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ اُس وقت اہل ایمان کا علم الیقین، عین الیقین میں ڈھل جاتا ہے اور اُس وقت کٹر سے کٹر ملحد اور کافر بھی یقین لانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس یقین کی وادی کا دروازہ موت ہے۔ (مرتب)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ آخرت میں اللہ کے فرشتے، انبیاء، شہداء اور صالحین گنہگاروں کی شفاعت کریں گے اور وہ ان کی شفاعت سے جہنم سے نکال لیے جائیں گے سوائے ان چار قسم کے مجرمین کے جن کا ذکر یہاں آیا ہے۔ یعنی جو نماز اور زکوٰۃ کے تارک ہیں، جو اہل باطل کی اسلام کے خلاف باتوں میں ان کے شریک رہتے ہیں اور جو قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

ہمارے جاننے والے چند اصحاب کو یہ بات تسلیم کرنے میں تردد ہے کہ یہاں نکذب بیوم الدین سے مراد تکذیب عملی ہے جبکہ صورتحال یہ ہے کہ یہاں جتنے بھی جرائم کا ذکر ہے ان سب کا تعلق عمل سے ہے، کسی ایک کا بھی تعلق قول سے نہیں ہے۔ منکر صلوٰۃ اور منکرِ زکوٰۃ مجرم نہیں بلکہ کافر ہے۔ جب کہ تارکِ صلوٰۃ اور تارکِ زکوٰۃ کافر نہیں ہے مجرم ہے۔ جرم یہ ہے کہ وہ زبان سے ان کا اقرار کر رہا ہے اور اپنے عمل سے ان کی تکذیب کر رہا ہے۔ اسی طرح سے جو زبان سے آخرت کا اقرار کرے لیکن اس عقیدے کے عملی تقاضوں کو پورا نہ کرے وہ آخرت کے عقیدے کی عملی تکذیب کا مجرم ہے کافر نہیں ہے۔ ایک مسلمان جب خوض کرنے والوں کے ساتھ خوض کرتا ہے اور زندگی کے دیگر معاملات میں اللہ کی حکم عدولی کرتا ہے، اُس وقت اس کے دل سے آخرت کا خوف نکل چکا ہوا ہے، چاہے زبان سے وہ آخرت کا اقرار کرتا ہو لیکن اپنے عمل سے وہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ یہاں ایسے ہی لوگوں کا اعترافِ جرم ہے۔ (مرتب)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ القیامۃ (75)

آیت نمبر (1 تا 15)

ترکیب

(آیت۔3) اَلَّنۡ میں ہمزہ استفہام نہیں ہے۔ اگر یہ ہمزۂ استفہام ہوتا تو اَلَنۡ آتا۔ لام پر تشدید بتا رہی ہے کہ یہ دراصل اَنۡ لَّنۡ ہے اور اَنۡ کا نون گرا ہوا ہے۔ قرآن مجید کے اس مقام پر اَنۡ کے نون کو گرا کر لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے، ورنہ عام عربی میں اس کو اَنۡ لَّنۡ ہی لکھتے ہیں البتہ پڑھتے اَلَّنۡ ہیں۔ (آیت۔4) قٰدِرُوۡنَ کے بجائے قٰدِرِیۡنَ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ اس لیے بَلٰی کے بعد لَنَجۡمَعَنَّ محذوف مانا جاتا ہے۔ اس طرح جملہ کا اصل مفہوم ہے کہ کیوں نہیں! ہم لازماً جمع کریں گے قادر ہوتے ہوئے اس پر کہ..... (آیت۔ 11) لَا وَزَرَ میں وَزَرَ ماضی کا صیغہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسم وَزَرٌ ہے۔ اس پر لائے نَفۡیِ جنس داخل ہونے کی وجہ سے یہ وَزَرَ ہوا ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/2)

ترجمہ

لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾	وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾
نہیں میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی	اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں بار بار ملامت کرنے والے نفس کی

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾	بَلٰی	قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ
کیا گمان کرتا ہے انسان کہ ہم ہرگز جمع نہیں کریں گے اس کی ہڈیوں کو	کیوں نہیں (ہم ضرور جمع کریں گے)	قادر ہوتے ہوئے اس پر کہ